سے مسلمانوں کے استفادہ اور رہنمائی وغیرہ کا ذکر ہے، چوتھے باب میں شرعی قوانین یعنی مسلم پرسنل لا میں اصلاح و تبدیلی کے مطالبہ کے بارہ میں مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے رجحانات اور حکومت کے عزائم اور منشا کی وضاحت کی گئی ہے، آخری باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سیکولرزم کی مختلف تعبیروں کی وجہ سے ابتک مسلمانوں کے سامنے اس کی واضح تصویر سامنے نہیں آسکی ہے، اسلیے وہ عموماً اس سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں، کتاب کے آخر میں تین ضمیمے ہیں، ان میں بالترتیب مسلم پرسنل لا قانون اطلاق شریعت (۳۷ء)، قانون تنسیخ نکاح (۳۹ء)، خصوصی قانون نکاح (۵۴ء) کے خلاصے دیے گئے ہیں، فاضل مصنف نے مسائل کا تجزیہ غیر جانبداری کے ساتھ کیا ہے، اور ہر طبقۂ خیال کے نقطۂ نظر کی بے کم و کاست ترجمانی کی ہے، ممکن ہے ان کے بعض رجحانات و نتائج ہر شخص کے لیے پوری طرح قابل قبول نہ ہوں لیکن انھوں نے بڑے غور و فکر اور گہرے مطالعہ کے بعد یہ کتاب لکھی ہے، اس لیے یہ پرمغز اور حشو و زوائد سے خالی ہے، ان کے خیالات معتدل و متوازن، تحریر شائستہ و متین اور انداز بیان علمی ہے۔

سرسید احمد خاں منتخب کتابیات، مرتبہ جناب محمد حسین رضوی تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۶۵، قیمت تحریر نہیں، پتہ مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

یہ سرسید احمد خاں مرحوم کے متعلق مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی انگریزی اور اردو کتابوں اور رسالوں کی فہرست ہے، اس میں سرسید کے تمام کتب و رسائل اور مکتوبات و مضامین اور ان پر لکھی گئی دوسرے ارباب قلم و مصنفین کی تصنیفات ...... اور ان کتابوں کا ذکر ہے جن میں ایک مضمون بھی سرسید یا علی گڑھ تحریک کے بارے میں ہے، کتابوں کے سائز، صفحات کی تعداد، مطبع، سنہ اشاعت اور رسالوں کی جلد و نمبر اور ماہ و سنہ کی تصریح بھی کی گئی ہے، سرسید اور علی گڑھ پر تحقیقی کام کرنے والوں کو اس فہرست سے بڑی مدد ملے گی،

"ض"

جلد ۱۱۳۔ ماہ محرم الحرام ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۴ء۔ عدد ۲

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

ملک میں ہر چیز کی قیمت پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے، ابھی اور بڑھ جائے گی، جو قیمت بڑھ جاتی ہو وہ پھر کم نہیں ہوتی ہے، کاغذ کی قیمت بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے، اور ابھی اور بڑھے گی، اب سے چند مہینے پہلے جو کاغذ ۳۵ روپئے فی ریم خریدا گیا تھا، وہ اب ۶۵ روپئے میں بھی مشکل سے مل رہا ہے، اس طرح دار المصنفین کتابوں کی طباعت میں مالی بحران میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے، کاغذ وقت پر دستیاب بھی نہیں ہوتا ہے جس سے کتابوں کی طباعت میں تاخیر ہوتی ہے اور اسکی بکری اور اشاعت پر اثر پڑتا ہے۔

کاغذ کی گرانی کے ساتھ کتابوں کی قیمت میں اضافہ ہونا بھی ضروری ہے، دار المصنفین کی مطبوعات کی قیمت اور کتابوں کے مقابلہ میں ہمیشہ سے نسبتاً کم رہی ہے، جب یہ ادارہ قائم ہوا تھا تو سو صفحے کی کتاب پر ایک روپیہ قیمت رکھی جاتی تھی، پھر ڈیڑھ روپئے رکھی گئی، اور جب ہر چیز کی قیمت کئی گنی ہوگئی تو یہاں کی مطبوعات کی قیمت میں تھوڑا سا اور اضافہ کیا گیا یعنی سو صفحے کی کتاب پر دو روپئے قیمت رکھی گئی، اب اس میں مزید اضافہ ناگزیر ہوگیا ہے، جس حساب سے کاغذ مل رہا ہے اور پھر کتابت و طباعت میں جو اخراجات ہوتے ہیں، اس لحاظ سے سو صفحے کی کتاب کی قیمت چار روپئے سے کم نہیں ہونی چاہئے، لیکن ہماری مطبوعات کی خریداری ایسے علمی حلقہ میں ہوتی ہے جس کی قوت خرید زیادہ نہیں بلکہ بہت کم ہے، جو ہماری مطبوعات خریدنے کے لیے بے چین رہتے ہیں، ان کے پاس اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے کے بعد اتنی رقم نہیں بچتی کہ وہ ہماری کتابیں خرید سکیں، اور جو صاحب ثروت آسانی سے کتابیں خرید سکتے ہیں انکو

علمی کتابیں خریدنے کا مطلق ذوق نہیں، اسی لیے ابتک ہم اپنی مطبوعات کی قیمت کے اضافہ کرنے میں پس وپیش کرتے رہے ہیں، حالانکہ اور جگہوں کی کتابوں کی قیمت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

ہم برابر اس کی طرف توجہ دلاتے رہے ہیں کہ اس ادارہ میں چالیس آدمی اس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، اس ادارہ کو مرکز یا ریاست کی حکومت سے کوئی مستقل سالانہ امداد نہیں ملتی ہے، اس کے اخراجات اس کی مطبوعات کی آمدنی سے پورے کیے جاتے ہیں، اخراجات کے مطابق اسکی مطبوعات کی قیمت مقرر ہونی چاہئے، مگر ایسا ابتک نہیں کیا گیا ہے، اسی لیے ہمیشہ یہ ادارہ خسارہ سے چلتا رہا ہے، ۱۹۶۵ء سے اس کا خسارہ چالیس اور پچاس ہزار کے درمیان ہو رہا ہے، مگر محض تائید ایزدی سے اسکا کام کسی نہ کسی طرح چل رہا ہے، اس کے خدمت گذار ابتک ایثار سے کام لے رہے ہیں، مگر بڑھتی ہوئی گرانی میں ایثار کا جذبہ برقرار رہنا مشکل ہے، اور یہ وصف ملک میں بے معنی ہو کر رہ گیا ہے، پھر بھی ہمارے اسٹاف کے لوگوں میں اس کی خدمت کا حوصلہ باقی ہے، ان کو جتنی کم ماہانہ تنخواہیں مل رہی ہیں، اتنی ملک کے کسی ادارہ میں نہ ہونگی، اسی لیے یہ خطرہ لاحق ہوتا جا رہا ہے کہ کہیں اپنی تنخواہوں کو اپنی قوت لا یموت کے لیے ناکافی سمجھ کر اس کی خدمت سے کنارہ کشی اختیار نہ کرلیں، اس لیے ان خدمت گذاروں کی ضروریات زندگی بھر کے اخراجات فراہم کرنا تو انتہائی ضروری ہے، تاکہ ان میں بددلی پیدا نہ ہو، مگر کیسے؟ کتابوں کی قیمت میں تو اضافہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے، مگر یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں یہ اضافہ ہمارے خریداروں کی قوت خرید کے لیے گراں نہ ثابت ہو۔

ہم بارہا اپیل کر چکے ہیں کہ اگر ہماری مطبوعات کی خریداری خاطر خواہ طریقہ پر ہوتی رہے تو ہم اپنے اخراجات پورے کر سکتے ہیں، ہم ملک سے کبھی نہ چندے اور نہ مالی امداد کے خواہاں ہوئے ہیں، صرف اپنی

مطبوعات کی خریداری کی اپیل برابر کرتے رہے ہیں لیکن ہماری اپیل ہمیشہ صدا بصحرا ثابت ہوئی، ہماری مالی پریشانیوں پر ہمدردی کا اظہار کسی نے دس پیسے کا کارڈ لکھ کر بھی نہیں کیا، البتہ اگر ہماری مطبوعات کی قیمت پر کچھ اضافہ ہوا تو احتجاج میں کچھ خطوط ضرور موصول ہونگے، مگر سوال یہ ہے کہ اب اس ادارہ کے خدمت گذار پیٹ پر پتھر باندھ کر خدمت کر سکیں گے کہ نہیں،

حکومت ہند ہمارے ادارہ کی طرف مائل ہوئی ہے، اسکو ایک قومی اہمیت کا ادارہ قرار دیکر سالانہ امداد دینے پر غور کرنے کے لیے تیار ہے، گذشتہ سال حکومت ہند کے کچھ نمایندے اسکی ضروریات کا اندازہ لگانے کے لیے بھی آئے تھے، وہ اس کے علمی کارناموں سے متاثر ہوئے، ان کا مشورہ تھا کہ آیندہ اب ایسے نوجوان نہیں ملیں گے جو خدمت و ایثار کے جذبے سے کام لیکر یہاں اپنی ساری زندگی وقف کر دینے کو تیار ہوں، ان کو مالی منفعت حاصل ہوگئی تو یہاں رہ کر علمی خدمت میں بھی لگے رہیں گے، یہ مالی وسائل کتابوں کی فروخت سے پیدا کرنا ممکن نہیں، اس میں وسعت صرف حکومت کی امداد سے پیدا ہو سکتی ہے، انھوں نے زبانی طور پر کہا کہ اگر یہ ادارہ حکومت کی امداد لینا پسند کریگا تو اس کو دو سے تین لاکھ روپئے تک امداد دیجا سکتی ہے، اجب حکومت ادارہ کی طرف مائل ہے تو امداد حاصل کرنا آسان ہے، لیکن ہم پر یہ الزام آسانی سے رکھ دیاجائے گا کہ علامہ شبلیؒ کی وراثت کو ان کے نااہل جانشینوں نے حکومت کے ہاتھوں فروخت کر دیا، اور یہ اب علمی خدمت کرنے کے بجائے حکومت کا خدمت گذار بنکر رہیگا، ہم خود حکومت کا ضمیمہ بننا نہیں چاہتے، بشرطیکہ ہماری قوم ہماری سرپرستی کرتی رہے، اور ہم یہ سرپرستی حضرات اپنی مطبوعات کی زیادہ سے زیادہ خریداری کی صورت میں چاہتے ہیں، یا اہل ثروت ایک ہزار کے لائف ممبر بنکر ادارہ کی خدمت کر سکتے ہیں، جسکے بدلے میں انکو آتنی ہی قیمت کی کتابیں فراہم ہوتی رہینگی، مگر یقین ہے کہ یہ اپیل پہلے کی طرح رائگاں جائیگی، پھر ادارہ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو کر حکومت کیطرف مائل ہوجائیگا تو ہماری قوم کو علامہ شبلیؒ کے جانشینوں کو قابل الزام ٹھہرانے کا حق نہ ہوگا، اس وقت اپنی اپنی مجبوریوں کی بنا پر سارے علمی ادارے حکومت سے سالانہ امداد قبول کر رہے ہیں، صرف دار المصنفین ہی اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

مقالات

امام نوویؒ کی شرح مسلم پر ایک نظر

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

مصالح و حکم کا ذکر احادیث کی مصلحتوں اور ان میں بیان کیے گئے احکام کی حکمتیں بھی بیان کرتے ہیں، اس نوعیت کی بعض مثالیں درج ہیں :۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سباطہ (گھور) پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا ذکر ہے، علامہ نووی نے اس کے وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام خطابی و بیہقی وغیرہ کا بیان ہے کہ صلب کے درد سے شفایابی کے لیے اہل عرب کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے، اس لیے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پسلی میں درد رہا ہوگا، امام شافعیؒ نے بھی یہی وجہ بیان کی ہے،

(۲) امام بیہقیؒ وغیرہ نے ایک ضعیف روایت یہ کی ہے کہ آپ کے گھٹنے میں کوئی تکلیف یا بیماری تھی، اس لیے آپنے کھڑے ہو کر پیشاب کیا تھا،

(۳) ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہاں آپ کو بیٹھنے کی جگہ نہیں مل سکی تھی اسلیے مجبوراً کھڑے ہو کر پیشاب کرنا پڑا،

(۴) ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ نے محض بیان جواز کے لیے کھڑے ہو کر پیشاب کیا تھا ورنہ آپ کی مستقل عادت بیٹھکر ہی پیشاب کرنے کی تھی جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

من حدثکم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یبول قائما فلا تصدقوا، ما کان یبول الا قاعدا

جو شخص یہ کہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے، اس کی بات نہ مانو، آپ تو محض بیٹھکر ہی پیشاب کرتے تھے،

اس حدیث کی سندیں قوی ہیں، امام احمد، ترمذی، نسائی اور دوسرے محدثین نے اس کی تخریج کی ہے، اس کے علاوہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی ممانعت میں جو حدیثیں مروی ہیں، وہ ثابت نہیں ہیں، مگر یہ حدیث صحیح ہے، اسی لیے علماء نے بلا عذر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کو مکروہ بتایا ہے،

(ج ۳ ص ۱۶۵ و ۱۶۶)

بعض حدیثوں میں اذان کے برخلاف اقامت کے الفاظ صرف ایک ہی دفعہ کہنے کا ذکر ہے، شوافع اور محدثین کے نزدیک یہی مسلک قوی ہے، امام نووی نے اس کی یہ مصلحت تحریر کی ہے

"اذان غائب اور غیر موجود لوگوں کو باخبر کرنے کے لیے کہی جاتی ہے، اس لیے اس کے الفاظ مکرر ادا کیے ... جاتے ہیں، تاکہ پوری طرح سب کو اطلاع ہو جائے، مگر اقامت کا مقصد محض موجود اور حاضر لوگوں کو مطلع کرنا ہے، اس لیے اس میں تکرار و اعادہ کی ضرورت نہیں بلکہ صرف ایک ہی دفعہ کہدینا کافی ہے، اقامت کے برخلاف اذان کے الفاظ زیادہ زور سے کہے جانیکی یہی وجہ ہے، البتہ قد قامت الصلاۃ کو دو بار اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہی اقامت کا اصل مقصد ہے۔ واللہ اعلم (ج ۴ ص ۷۹)

نماز میں ہاتھ باندھکر کھڑے ہونے کی حکمت و مصلحت ملاحظہ ہو:-

"خضوع و خشوع کا یہ نہایت موزوں اور مناسب طریقہ ہے، کیونکہ اسکی وجہ سے ہاتھ بیکار اور فضول کاموں میں مشغول نہیں ہو سکتے" (ج ۴ ص ۱۱۵)

بعض حدیثوں کے اصل دین اور مہتم بالشان ہونے کا ذکر

بعض حدیثیں اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے بڑی اہم اور مہتم بالشان ہوتی ہیں، امام نووی ان کی جانب خاص طور پر متوجہ ہوتے ہیں اور ان کے اصل دین ہونے کی وضاحت کرتے ہیں، مثلاً وہ حدیث جس میں حضرت جبریلؑ کے آپ کے پاس آنے اور ایمان و اسلام اور احسان کے بارہ میں سوال کرنے اور آنحضور صلعم کے جواب دینے کا ذکر ہے، اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

"اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان، اسلام اور احسان کو دین بھی کہا جا سکتا ہے اور یہ سمجھ لو کہ یہ حدیث گوناگوں حقائق و معارف اور آداب و لطائف کی جامع بلکہ اسلام کی اصل الاصول ہے۔" (ج ۱ ص ۱۶۰)

بنی الاسلام علی خمس الخ کے متعلق لکھتے ہیں:-

"دین کی معرفت میں اس حدیث کی حیثیت ایک اصل عظیم کی ہے، اور اس پر اس کا دار و مدار ہے کیونکہ یہ ارکان دین کی جامع ہے" (ج ۱ ص ۱۷۹)

ایک حدیث میں حضرت عثمانؓ کے اس طور پر وضو کرنے کا ذکر ہے جس طور پر خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تھا، امام نووی اس کے بارہ میں تحریر کرتے ہیں:-

"وضو کے سلسلہ میں اس حدیث کی حیثیت ایک اصل عظیم کی ہے" (ج ۳ ص ۱۰۶)

ایک حدیث میں اس امر کا ذکر ہے کہ اگر کسی شخص کو نماز میں کوئی شک و شبہہ ہو جائے تو محض اس کی وجہ سے نماز خراب نہیں ہو سکتی بلکہ جب اس کی خرابی کے متعلق قطعی طور پر یقین ہو جائے تب ہی نماز میں فتور اور نقصان لاحق ہوگا، چنانچہ لکھتے ہیں

"یہ حدیث اسلام کے اہم اصول اور فقہ کے بنیادی قاعدہ پر مشتمل ہے، اس کی تفصیل یوں ہے کہ اشیاء کو ان کی اصلوں پر برقرار رکھنا چاہیے، تاآنکہ اس کے برعکس یقین ہو جائے،

محض شک طاری ہونے سے ان کی اصل میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی، جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے،
کہ اصل طہارت کا تیقن ہے، اس لیے اگر حدث کے متعلق کوئی شبہ بھی ہو جائے تب بھی طہارت کا حکم
باقی اور برقرار رہے گا۔" (ج ۴ ص ۴۹)

امام مسلم پر نقد

علامہ نووی نے محض متقدمین کے اقوال جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ انھوں نے
دقتِ نظر سے ان اقوال کا جائزہ بھی لیا ہے اور جانچنے اور پرکھنے کے بعد ان کو جن بیانات میں ضعف
وسقم نظر آیا ہے ان کی تردید کی ہے، اور جو اقوال قوی اور مرجح معلوم ہوئے ہیں ان کے وجوہ ترجیح
تحریر کیے ہیں، وہ ابن صلاح اور قاضی عیاض جیسے اکابر فن پر بھی جن کی کتابوں سے انھوں نے
بڑا استفادہ کیا ہے، نقد و جرح کرتے ہیں، اور محدثین و شارحین حدیث کے علاوہ فقہاء اور دوسرے
طبقہ و فن کے علماء پر بھی انھوں نے نقد و تعاقب کیا ہے، ذیل میں ان کے نقد و جرح کے کچھ نمونے
پیش کیے جاتے ہیں، مگر طوالت کے خوف سے محض ان ہی تنقیدوں کا ذکر کیا جائے گا جو امام مسلم
پر کی گئی ہیں،

امام مسلمؒ نے اپنی صحیح کی ابتدا میں "وصلی اللہ علی محمد خاتم النبیین الخ" لکھا ہے، اس سلسلہ میں ان پر
یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ انھوں نے محض صلوٰۃ ہی کہنے پر اکتفا کیا ہے، حالانکہ اس کے ساتھ ان کو
تسلیم کا بھی ذکر کرنا چاہیے تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا حکم دیا ہے، ارشاد ربانی ہے:-

یا ایھا الذین آمنوا صلوا علیہ	ایمان والو! پیغمبر پر درود و سلام
وسلموا تسلیما (احزاب)	بھیجتے رہو۔

اس بنا پر امام مسلمؒ کو صلی اللہ وسلم علی محمد خاتم النبیین الخ لکھنا چاہیے تھا،
علامہ نووی نے اس اعتراض کو درست قرار دیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ خیال
کرنا مناسب نہیں ہے کہ نماز کے اندر بھی صلوٰۃ کا ذکر بلا تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ صلوٰۃ سے پہلے

تشہد میں اس کا ذکر آچکا ہے، اسی بنا پر بعض صحابہ کرامؓ نے تشہد سیکھنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سے کہا تھا کہ آپ نے ہم کو تشہد تو سکھا دیا ہے مگر ہم آپ پر درود کس طرح بھیجیں؟ علماء نے تصریح
کی ہے کہ آپ پر بلا سلام محض صلوٰۃ بھیجنے پر اکتفا کرنا مکروہ ہے، واللہ اعلم (ج ۱ ص ۴۴)

معنعن روایتوں کے متعلق امام مسلمؒ نے اپنے مقدمہ میں مبسوط و معرکۃ الآراء بحث کی ہے،
اس میں انھوں نے امام بخاریؒ کے مسلک پر سخت لب و لہجہ میں تنقید کی ہے، مگر نووی نے
امام بخاری اور دوسرے علمائے محققین کے نقطۂ نظر کی تصویب اور امام مسلم کے نقطۂ نظر پر
نقد کیا ہے، طوالت کی وجہ سے یہ دلچسپ بحث نظر انداز کیجاتی ہے، ملاحظہ ہو (ج ۱ ص ۱۲۷، ۱۲۸)

بعض جگہ امام مسلم کے لغوی مسامحات اور ان کے اولی و فصیح کے بجائے غیر اولی اور
غیر فصیح الفاظ استعمال کرنے کا ذکر ہے، مثلاً ایک جگہ انھوں نے [لو ضربنا عن حکایتہ]
لکھا ہے، نووی اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:-

"صحیح مسلم کے نسخوں میں اسی طرح ہے، یہ اگرچہ صحیح ہے جیسا کہ ازہری نے لکھا ہے کہ ضربت
عن الامر، اضربت عنہ کی طرح اعرضت وکففت عنہ کے معنی میں بولا جاتا ہے، مگر قلیل الاستعمال
ہے، مشہور اضربت ہی ہے جو جمہور کا خیال ہے۔" (ج ۱ ص ۱۲۸ و ۱۲۹)

امام مسلم کے اس فقرہ [وہی فی زعم من حکینا قولہ واہیۃ] واہیۃ کے متعلق رقمطراز ہیں:-

"اگر وہ اس کے بجائے ضعیفۃ لکھتے تو زیادہ بہتر اور عمدہ تھا، کیونکہ اس کے قائل کا
منشاء یہ نہیں ہے کہ وہ واہی اور انتہا درجہ کی ضعیف روایت ہے، جو واہیۃ کے اصل معنی
ہیں، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ضعیف روایت ہے، اور اس سے کوئی حجت قائم نہیں ہوسکتی۔"
(ج ۱ ص ۱۳۸)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

"اوقفت الجز ہی اصل نسخے میں ہے مگر یہ شاذ اور غریب لغت ہے، مشہور اور صحیح وقفت الجز بغیر الف کے ہے۔" (ج ا ص ۱۳۲، ۱۳۳)

امام مسلم کی عظمت و احتیاط کا اعتراف

ان تنقیدوں سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ امام مسلم کی عظمت و جلالت کے معترف نہ تھے، بلکہ ان کے نزدیک امام مسلم کی مہارت و حذاقت فن مسلّم ہے، اور وہ جابجا انکی حدیث میں تبحر و معرفت، دقت نظر اور احتیاط و تیقظ کا ذکر و اعتراف کرتے ہیں، اپنے مقدمہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"امام مسلم نے اپنی صحیح میں غیر معمولی احتیاط و اتقان سے کام لیا ہے، اور یہ ان کے ورع و تقوی میں کمال، کثرت علم، وسعت نظر، شدت ضبط و حفظ، حدیث میں غیر معمولی تحقیق و کاوش اور اس کے انواع میں مکمل مہارت و واقفیت کا نتیجہ ہے، اس درجہ احتیاط و تحقیق کی مثالیں بہت کم لوگوں کے یہاں ملیں گی، ہم چند مثالیں اس لیے نقل کرتے ہیں کہ ان حقائق سے صرف وہی لوگ واقف ہو سکتے ہیں جن کی اس کتاب پر عمدہ نظر ہو، اور وہ فن حدیث سے متعلق تمام علوم فقہ، اصول فقہ، عربیت، اسماء الرجال، تاریخ و علم اسناد کے دقیق مسائل سے مکمل واقف کار ہوں، اور ان فنون کے ماہرین اور فضلاء کی صحبتوں میں رہ کر انکے بارہ میں بحث و مباحثہ کرتے رہے ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ذہن رسا اور حسن فکر عطا کیا ہو اور ان کا علم حدیث اور اس سے متعلقہ علوم میں ہمیشہ اشتغال بھی رہا ہو۔"

امام مسلم کی غیر معمولی تحقیق و تحری کی مثال یہ ہے کہ وہ حدثنا و اخبرنا کے درمیان فرق و امتیاز پر خاص توجہ مبذول کرتے ہیں، ان کے نزدیک ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ حدثنا کا اطلاق اسی وقت جائز ہو سکتا ہے کہ جب راوی نے روایت کو خاص طور سے اپنے شیخ سے سنا ہو اور اخبرنا کا اطلاق اس روایت پر ہوتا ہے جو اس کے شیخ کے سامنے پڑھی گئی ہو، یہی فرق و امتیاز

امام شافعی اور ان کے تلامذہ نیز مشرق کے جمہور اہل علم نے کیا ہے، محمد بن حسن جوہری نے اسی کو بیشمار محدثین کا مسلک بتایا ہے، ابن جریج، اوزاعی، ابن وہب اور امام نسائی سے بھی اسی کی روایت کی گئی ہے، اور یہی اہل حدیث کا مشہور و معروف مذہب ہے، مگر دوسری جماعت کا خیال ہے کہ شیخ کے سامنے پڑھی جانے والی حدیث کے لیے حدثنا اور اخبرنا دونوں کہنا جائز ہے، یہ امام مالک، زہری، سفیان بن عیینہ اور یحییٰ بن سعید القطان اور دیگر متقدمین کا مذہب ہے، امام بخاری اور محدثین کی ایک جماعت اور کوفہ و حجاز کے اکثر علما بھی اسی کے قائل ہیں، ایک جماعت کے نزدیک حدثنا اور اخبرنا کا اطلاق قرأت پر کرنا جائز نہیں ہے، یہ ابن مبارک، یحییٰ بن یحییٰ اور احمد بن حنبل کا مسلک ہے، اور امام نسائی سے بھی مشہور روایت یہی ہے،

اسی طرح امام مسلم رواۃ کے الفاظ کے اختلاف کو ضبط کرنے کی جانب بھی خاص اعتناء کرتے ہیں، جیسے وہ کہتے ہیں [حدثنا فلان و فلان واللفظ لفلان قال او قالا حدثنا فلان] ایسے ہی جب دو راویوں کے درمیان حدیث کے متن کے حرف میں اختلاف یا راوی کے وصف و نسب یا ان کے علاوہ اور باتوں میں فرق ہوتا ہے تو وہ اس کو بیان کرتے ہیں، حالانکہ بعض دفعہ ایسا فرق ہوتا ہے جس سے معنی و مفہوم میں کوئی تغیر نہیں ہوتا اور کبھی معنی میں فرق ضرور ہوتا ہے، لیکن وہ اس قدر خفی اور دقیق ہوتا ہے کہ اسکو سمجھنے کے لیے مذکورہ بالا علوم میں ماہر ہونا ضروری ہے، (ج ا ص ۲۱ و ۲۲)

شرح میں بھی ان کے ضبط و اتقان اور حزم و احتیاط کا ذکر کرتے ہیں، مندرجہ ذیل سند کے بارہ میں رقمطراز ہیں :-

"عن ابی معبد عن ابن عباس عن معاذ بن جبل قال ابو بکر ربما قال وکیع عن ابن عباس

ان معاذا ...."

یہ امام صاحب کی غیر معمولی تحقیق د احتیاط اور خاص دقت نظر کا ثبوت ہے، کیونکہ پہلی روایت میں عن معاذ اور دوسری میں ان معاذا ہے، اور "ان" و "عن" میں فرق ہو گو جمہور کے خیال میں "ان" بھی "عن" ہی کی طرح ہے، اس لیے وہ اس کو بھی اتصال پر محمول کرتے ہیں، مگر ایک جماعت کے نزدیک دونوں میں فرق ہے، اس لیے اس کے نزدیک "ان" کو انقطاع پر محمول کیا جائے گا اور وہ روایت مرسل سمجھی جائے گی، البتہ یہاں یہ صحابی کے مرسل ہونے کی وجہ سے متصل کے حکم میں ہوگی، یہی علماء کا مشہور مذہب ہے، پس امام مسلم نے احتیاط کی وجہ سے دونوں حرفوں کو الگ الگ بیان کیا ہے"۔ (ایضاً ج ا ص ۱۹۶)

شرح میں اس قسم کی احتیاط و دقت نظر کی مثالیں بے شمار ہیں،

امام مسلم کی مدافعت | جس طرح وہ امام مسلم کی بعض غلطیوں کی نشاندھی کرتے ہیں، اسی طرح جہاں ان کو امام مسلم پر کیے جانے والے اعتراضات غلط اور بے وزن معلوم ہوتے ہیں، وہاں انکی پُر زور تردید کر کے امام مسلم کے نقطۂ نظر کی تائید و حمایت بھی کرتے ہیں، اس سے بھی ان کے زور استدلال اور نقد و نظر کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے، اس لیے چند مثالیں پیش کیجاتی ہیں:

"صحیح مسلم کے ابتدائی جس عبارت پر اعتراض کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اسی میں [وعلی جمیع الانبیاء والمرسلین] بھی ہے، اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ انبیاء کے ذکر کے بعد مرسلین کے ذکر کی کوئی ضرورت نہ تھی، کیونکہ مرسلین بھی انبیاء میں داخل ہیں، اور رسول نبی بھی ہوتا ہے، بلکہ اس کو نبی کے مقابلہ میں بعض مزید خصوصیت بھی حاصل ہے۔

امام نوویؒ نے اس کے دو جواب دیے ہیں، پہلا یہ کہ ایسا کرنا بالکل جائز اور روا ہے کیونکہ مزید اہتمام کے لیے عام کے بعد خاص کو ذکر کیا جاتا ہے، قرآن مجید میں اس کی متعدد

مثالیں ہیں، چنانچہ ایک جگہ ہے :-

من کان عدوا للہ وملائکتہ	جو شخص اللہ کا دشمن ہو اور اس کے فرشتوں کا
ورسلہ وجبریل ومیکال (بقرہ)	اور اس کے رسولوں کا اور جبرئیل کا اور میکائیل کا

دوسری جگہ فرمایا :-

واذ اخذنا من النبیین میثاقھم	اور یاد کرو جب ہم نے نبیوں سے
ومنک ومن نوح وابراھیم وموسیٰ	ان کا میثاق لیا اور تم سے اور نوحؑ
	ابراہیمؑ اور موسیٰؑ سے لیا،

اس کے برخلاف بعض جگہ خاص کے بعد عام کا استعمال کیا گیا ہے، مثلاً حضرت نوحؑ کی زبانی نقل کیا گیا ہے کہ

ربّ اغفر لی ولوالدیّ ولمن	اے میرے خداوند! مجھکو اور میرے ماں باپ کو
دخل بیتی مومنا وللمومنین	اور جو شخص ایمان لاکر میرے گھر میں پناہ لینے آیا ہے
والمومنات (نوح)	اسکو اور عام مومن مردوں اور عورتوں کو بخش دے،

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ مرسلین کے لفظ میں جو عموم ہے وہ انبیاء میں نہیں ہے، کیونکہ اللہ کے ان تمام رسولوں کو شامل ہے، جو آدمیوں اور ملائکہ میں سے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے :-

اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلا	اللہ فرشتوں میں سے بعض کو اپنے احکام
ومن الناس (حج)	پہنچانے کے لیے انتخاب فرما لیتا ہے اور اسی طرح
	بعض کو) آدمیوں میں سے (بھی)

ظاہر ہے کہ ملک کو نبی نہیں کہا جا سکتا، اس لیے مرسلین کے لفظ لانے سے جو فائدہ ہوا وہ نبیین کے لفظ لانے سے نہیں ہو سکتا تھا، (ج ا ص ۴۴)

ایک سند کے متعلق امام مسلم پر دو اعتراض کیے گئے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ ایک طریق میں انھوں نے [حدثنی] اور دوسرے میں [حدثنا] کہا ہے، امام نووی نے اس کا مندرجۂ ذیل جواب دیا ہے :-

"اہل فن کا عام اور معروف قاعدہ یہ ہے کہ جس حدیث کو وہ تنہا اپنے شیخ سے سنتے ہیں، اس کے لیے وہ [حدثنی] کا لفظ لاتے ہیں، اور جس کے سماع میں ان کے ساتھ اور لوگ بھی شریک ہوتے ہیں اسکو وہ [حدثنا] کے لفظ سے ذکر کرتے ہیں، اسی طرح جس حدیث کو وہ تنہا اپنے شیخ کے سامنے پڑھتے ہیں اس کے لیے [اخبرنی] اور کئی آدمیوں کی موجودگی میں پڑھی جانے والی حدیث کے لیے [اخبرنا] لاتے ہیں، یہ محدثین کی مشہور اصطلاح اور مالوف طریقہ ہے، اس کو ترک کرنے سے سماع کی صحت میں کوئی فرق نہیں آتا، مگر یہ اولیٰ واحوط طریقہ کے منافی ہے۔" (ج ا ص ۱۵۱)

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ پہلے طریق میں [حدثنا وکیع عن کہمس عن عبداللہ بن بریدہ عن یحیی ابن یعمر] اور دوسرے میں بھی [حدثنا عبیداللہ بن معاذ العنبری، حدثنا ابی حدثنا کہمس عن ابن بریدہ عن یحییٰ] کہا گیا ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ غیر ضروری طوالت امام مسلم کے اختصار و اتقان کے منافی ہے، امام نووی اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ" یہ اعتراض غلط اور فن سے ناواقفیت اور بے خبری کا نتیجہ ہے، امام مسلم اختصار پسند ضرور ہیں مگر جہاں اختصار سے مقصد میں کوئی خلل ہو یا اس کے سرے سے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو، وہاں وہ اختصار سے کام نہیں لیتے پس اگر وہ یہاں اختصار سے کام لیتے تو مقصد ہی حاصل نہ ہوتا، اس کی توضیح یوں ہے کہ وکیع کی روایت میں [عن کہمس] ہے، مگر معاذ نے [حدثنا کہمس] کہا ہے، اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ معنعن روایتوں سے استدلال و احتجاج میں علمائے فن کا اختلاف ہے لیکن ان روایتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے جو [حدثنا] کی وجہ سے متصل ہوتی ہیں، اسی بنا پر امام مسلم نے

دونوں کو اس طرح سے بیان کیا ہے جس طرح سے ان کا سماع کیا گیا ہے تاکہ متفق علیہ و مختلف فیہ میں امتیاز کیا جا سکے، اور یہ ان کی غیر معمولی احتیاط کا ثبوت ہے۔ صحیح مسلم میں اس کی اور متعدد مثالیں ہیں جنکو ان کے مواقع پر بیان کیا جائے گا۔

اس تکرار و طوالت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وکیع کی روایت میں [عن عبداللہ بن بریدہ] ہے جب کہ معاذ کی روایت میں [عن ابن بریدہ] ہے، پس اگر وہ ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کو بیان کرنے پر اکتفا کرتے تو خلل واقع ہو جاتا۔ کیونکہ اگر وہ ابن بریدہ کہتے تو ہم کو انکا اصل نام نہ معلوم ہوتا اور نہ ہم متعین طور پر یہ جان سکتے تھے کہ یہ عبداللہ ابن بریدہ ہیں یا ان کے بھائی سلیمان بن بریدہ، اور اگر وہ عبداللہ بن بریدہ کہتے تو یہ معاذ پر کذب و افترا ہوتا کیونکہ ان کی روایت میں عبداللہ مذکور نہیں ہے۔

البتہ دوسرے طریق میں یحیی بن یعمر کو ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ دونوں طریقے ابن بریدہ کی روایت میں جمع ہو گئے ہیں۔ اور ان دونوں کے الفاظ بھی یحیی کے واسطے سے یکساں اور ایک ہی صیغہ کے ساتھ وارد ہیں مگر میں نے بعض نسخوں میں پہلے طریق میں صرف [عن یحییٰ] دیکھا ہے اور اس میں [ابن یعمر] کا ذکر نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اسکا بھی وہی فائدہ اور مقصد ہو گا جو [ابن بریدہ] کے سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے۔ (ج ا ص ۱۵۲)

علم الاسناد کے بعض لطائف

امام نووی رجال و اسناد کے ماہر تھے اس لئے انھوں نے اس شرح میں ان سے متعلق بھی بڑا مفید مواد اکٹھا کر دیا ہے، گذشتہ مباحث میں اس کے متعدد نمونے پیش کئے جا چکے ہیں۔ یہاں ان کے اسناد سے متعلق بعض لطائف اور دلچسپ امور کا ذکر مقصود ہے، امام نووی نے اکثر سندیں نقل کرنے کے بعد ان کے لطائف بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ فلاں سند کے تمام رواۃ ایک ہی شہر کے ہیں یا

ان کے تین تین یا چار چار راوی تابعی یا صحابی ہیں، یا اس میں اصغر سے اکبر نے روایت کی ہے، بعض بعض سندوں میں اس طرح کے دو دو لطیفے جمع ہو گئے ہیں۔ جیسے ان کے تمام راوی ایک ہی شہر کے ہیں اور ان میں اصاغر نے اکابر سے روایت کی ہے، امام نووی نے شرح بخاری کے شروع میں ان رباعیات کو مع سندوں کے جمع کر دیا ہے، جن میں چار چار صحابہ نے باہمدگر یا چار چار تابعین نے ایک دوسرے سے روایت کی ہے۔ بعض بعض جگہ امام مسلم مسلسل کئی کئی سندیں اس طرح کی نقل کرتے چلے گئے ہیں۔ جن کے اساد کے تمام رجال ایک ہی مقام کے ہیں، نووی نے ان مواقع کی نشاندہی کر کے لطائف کی وضاحت کر دی ہے۔

لغت و عربیت کے مباحث

لغت و عربیت میں بھی امام نووی کی وسیع النظری اور عالمانہ تبحر مسلم ہے، یہ کتاب اس حیثیت سے بھی نہایت اہم ہے اور اس میں لغت و عربیت سے متعلق مختلف نوعیت کے مسائل و مباحث شامل ہیں، مثلاً الفاظ کی ضبط و تحقیق، حرکات و اعراب کا ذکر، مفرد، تثنیہ و جمع اور تذکیر و تانیث وغیرہ کی تصریح، مترادف الفاظ اور مختلف قبائل کی زبانوں کا دقیق فرق، لغات میں ائمہ لغت کے اقوال و اختلافات کا ذکر، قرآن مجید و کلام عرب سے ان کے بارہ میں شواہد و امثال کا ذکر، مصطلحات فن اور شرعی اصطلاحات کی شرح و تبیین، کلام کے اسالیب اور بلاغتوں، مشکل جملوں اور محاوروں کی وضاحت اور بعض بعض فقروں کے مختلف معنوں کی تشریح کی گئی ہے ذیل میں اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

ایک جگہ خبر و شہادت کے اصطلاحی الفاظ کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"بعض اوصاف میں یہ دونوں مشترک ہیں لیکن بعض میں مختلف ہیں۔ جیسے اسلام، عقل بلوغ، عدالت، مروت اور جس واقعہ کی خبر یا شہادت دی جائے اس کے ضبط کے بارہ میں

یہ دونوں مشترک ہیں، مگر حریت، ذکوریت، تعداد، تہمت اور اصل کی موجودگی میں فرع کے اعتبار میں ان کے درمیان فرق ہے چنانچہ عبد، عورت اور فرد واحد کی خبر مقبول سمجھی جاتی ہے۔ اور اصل کی موجودگی میں بھی فرع کی خبر تسلیم کر لی جاتی ہے، جیسے شیخ واستاد کی موجودگی میں شاگرد کی خبر مان لی جائے گی مگر ان لوگوں کی شہادت نہیں مانی جاتی سوائے عورت کے جس کی شہادت اس وقت معتبر مانی جاتی ہے جب کہ اس کے ساتھ کوئی اور عورت بھی شہادت دے، اسی طرح متہم ہونے کی صورت میں بھی شہادت رد کر دی جاتی ہے، جیسے کسی شخص کی اپنے دشمن کے بارہ میں گواہی قبول نہیں کیجائے گی، اسی طرح کسی شخص کی اپنی ذات یا اپنے لڑکے اور اپنے والد کے بارہ میں بھی شہادت معتبر نہیں سمجھی جائے گی، البتہ اعمی کی شہادت میں اختلاف ہے، امام شافعیؒ اور بعض لوگوں نے اسے منع کیا ہے، مگر امام مالکؒ وغیرہ کے نزدیک اس کی شہادت جائز ہے۔ لیکن اس کی خبر کے مقبول ہونے میں سب کا اتفاق ہے، شریعت نے شہادت اور خبر کے درمیان ان اوصاف میں اس لئے تفریق کی ہے کہ شہادت کی نوعیت ایک خاص آدمی سے متعلق ہوتی ہے اس لئے اس میں تہمت ظاہر ہے مگر خبر عام ہے اور اس کا تنہا اسی شخص سے تعلق نہیں ہوتا۔ جس کو خبر دیجاتی ہے۔ بلکہ اور لوگوں سے بھی وہ متعلق ہوتی ہے اس لئے اس میں تہمت کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ (ج ۱ ص ۴)

بعض جملوں میں بظاہر یکسانیت کی بنا پر ظاہر بیں لوگوں کو ان میں کوئی فرق نہیں نظر آتا اور وہ ان کو تکرار یا تاکید پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن غور و فکر کرنے سے ان کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے، اس طرح کے ایک جملہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

ان الواجب علی کل احد　　ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے

عرف التمییز بین صحیح الروایات — جو صحیح وسقیم روایات اور انکے ثقہ
وسقیمہا وثقات الناقلین — ومتہم راویوں میں تمیز کرتا
عن المتھمین الخ — ہو کہ الخ

اس کی نوعیت تکراری نہیں ہے جس کی غرض تاکید ہوتی ہے بلکہ اس میں دراصل روایت کے متن اور سند دونوں کا ذکر ہے کیونکہ بعض روایتیں نفس متن کے لحاظ سے درست ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی بعض سندوں کے ناقلین متہم ہوتے ہیں (ص ۶۰)

حدیث جبریل کے مندرجہ ذیل جملہ :-

ان تعبد اللہ ولا تشرک بہ — یہ کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کا کسی کو ساجھی نہ بناؤ،

کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں [ولا تشرک بہ] نہ تو زائد ہے اور نہ اس کا مقصد تکرار ہے بلکہ اس کی بجائے خود ایک مستقل حیثیت ہے، اس کو عبادت کے بعد اس لئے لایا گیا ہو کہ کفار نے اللہ کی عبادت کرنے کے باوجود اس کے شرکا بھی ٹھہرا لئے تھے، اس لئے وہ بتوں کو خدا کا ساجھی مان کر ان کی عبادت کرتے تھے، بس یہ کہکر گویا اس کی نفی کی گئی ہو واللہ اعلم (ج ۱ ص ۱۶۲)

وہ حدیث کے لفظوں کے موزوں ومناسب ترین ہونے کا ذکر بھی کرتے ہیں مثلاً اسی حدیث میں جو اوپر گذری ہے، یہ الفاظ بھی آئے ہیں [وتقیم الصلوۃ المکتوبۃ وتؤدی الزکاۃ المفروضۃ] ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :-

یہاں نماز کو مکتوبہ اس لئے کہا گیا ہے کہ قرآن مجید میں ہے۔

ان الصلوۃ کانت علی المومنین — کیونکہ مسلمانوں پر نماز بقید وقت

کتابا موقوتا (نساء) — فرض ہے،

متعدد حدیثوں میں بھی اس کا یہ وصف مذکور ہے مثلاً [اذا اقیمت الصلوۃ فلا صلوۃ الا المکتوبۃ] دوسری روایت میں ہے [افضل الصلوۃ بعد المکتوبۃ صلوۃ اللیل] ایک اور حدیث میں ہے۔ [خمس صلوات کتبھن اللہ] زکوۃ کو مفروضہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے وہ معجل زکوۃ مراد نہیں ہے جو حولان حول سے پہلے ہی ادا کر دی جائے کیونکہ اس کو مفروضہ نہیں کہا جاتا، یہ بھی کہا گیا ہے کہ تکرار سے بچنے کے لیے دونوں (صلوۃ وزکوۃ) کے لئے دو الگ الگ صفتیں لائی گئی ہیں، اس کا بھی احتمال ہے، کہ صدقہ تطوع کو پیش نظر رکھکر یہاں زکوۃ کو مفروضہ کہا گیا ہے کیونکہ از روئے لغت صدقہ تطوع پر بھی زکوۃ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ (ج ۱ ص ۱۶۳)

اسالیب کلام | وہ کلام کی بلاغتوں کے نکتے اور اس کے اسالیب بھی بیان کرتے ہیں مندرجہ ذیل سند [اما الاوزاعی وابن جریج فی حدیثھما] میں حذف وتقدیر کے اسلوب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"بعض نسخوں میں "فی حدیثھما" ایک ہی فا کے ساتھ ہے مگر اکثر میں [ففی حدیثھما] دو فا کے ساتھ ہے اور یہی درحقیقت بہتر ہے مگر وہ بھی جائز ہے کیونکہ اما کے جواب میں "ف" کا اثبات گو لازمی ہے مگر جب جواب قول میں قول محذوف ہو تو اسکو حذف کر دینا بھی روا ہے، یہ اسی قسم کی مثال ہے کیونکہ کلام کی اصل تقدیر اس طرح ہے، [اما الاوزاعی وابن جریج فقالا فی حدیثھما] قرآن مجید اور عربی زبان میں اس اسلوب کی متعدد مثالیں ملتی ہیں ایک جگہ ہے۔

فاما الذین اسودت وجوھھم اکفرتم (آل عمران) — تو جو لوگ روسیاہ ہوں گے (ان سے کہا جائیگا) کہ تمنے کفر کیا

یہ در اصل [فیقال لھم أکفرتم۔] تھا۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

واما الذین کفروا افلم تکن آیاتی تتلی علیکم (جاثیہ)

اور جو لوگ کفر کرتے رہے ان سے کہیں گے کیا تم کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں۔

یہ واما الذین کفروا فیقال لھم آفلم تکن آیاتی تتلی علیکم تھا۔ واللہ اعلم

ایک اور سند ہے [ان المقداد بن عمرو ابن الاسود الکندی وکان حلیفا لبنی زھرۃ وکان ممن شھد بدرا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال یا رسول اللہ الخ] اس کے متعلق فرماتے ہیں:۔

(انہ) طول کلام کی وجہ سے لایا گیا ہے اگر اس کا ذکر نہ ہوتا تب بھی یہ کلام صحیح ہوتا لیکن چونکہ کلام میں طویل فصل ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کا ذکر دوبارہ جائز اور بہتر ہو گیا، کلام عرب اور قرآن وحدیث میں اس کے بکثرت نظائر موجود ہیں،

قرآن مجید میں ایک جگہ کفار کی زبانی کہا گیا ہے کہ:۔

أیعدکم انکم اذا متم وکنتم ترابا وعظاما انکم مخرجون۔ (مومنون)

کیا (یہ شخص) تم سے کہتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور (مر کر) تمھاری مٹی اور ہڈیاں رہ جائیں گی تو تم (دوبارہ زندہ کر کے زمین سے) نکالے جاؤ گے،

اس میں طول بیان کی وجہ سے بعد میں (انکم) کا اعادہ کیا گیا ہے، ایک اور جگہ ہے:۔

ولما جاءھم کتاب من عند اللہ مصدق لما معھم وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہ (بقرہ)

اور جب خدا کی طرف سے ان کے پاس قرآن آیا جو اس (کتاب) کی جو ان کے پاس ہے ٹھیک ٹھیک مطابق ہے اور اس سے پہلے کافروں کے مقابلہ میں وہ اپنی فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے تو جب وہ چیز جس کو جانتے پہچانتے تھے، آ موجود ہوئی تو لگے اس سے انکار کرنے۔

یہاں [فلما جاءھم] بھی اسی لیے دوبارہ لایا گیا ہے، ایک حدیث میں ہے:۔

فقال یا ابا ھریرۃ واعطانی نعلیہ وقال اذھب بنعلی ھاتین

آپ نے فرمایا کہ اے ابو ہریرہؓ! اور آپ نے مجھکو اپنے دونوں جوتے عطا کیے اور کہا میرے ان دونوں جوتوں کو لیجاؤ۔

اس میں قال کا اعادہ فصل وطول کلام کی وجہ سے لایا گیا ہے، غرض یہ ایک عمدہ اور معروف اسلوب ہے۔ (ج ا ص ۱۰۳)

لغت وعربیت کی طرح بعض نحوی بحثیں بھی دلچسپ اور لائق ذکر ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کونسا عمل بہتر ہے، آپنے اس کا جواب دیا کہ فلاں، تو سائل نے پھر پوچھا، آپنے پھر جواب دیا کہ فلاں، اس روایت میں "ثم" کئی جگہ آیا ہے، اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اگر یہ کہا جائے کہ حرف ثم ترتیب کے لیے آتا ہے تو یہ جواب دیا جائے گا کہ وہ یہاں صرف ذکر وبیان میں ترتیب کے لیے لایا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وما ادراک ما العقبۃ فک رقبۃ

اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے، گردن کا

او اطعام فی یوم ذی مسغبة	(غلامی یا قرض کے پھندے سے) چھڑا دینا
یتیما ذا مقربة او مسکینا ذا	یا بھوک کے دن یتیم رشتہ دار یا محتاج خاک نشین
متربة ثم کان من الذین آمنوا الخ	کو کھانا کھلانا، اسکے علاوہ ان لوگوں کے
(بلد)	زمرے میں ہونا جو ایمان لائے۔

یہاں واقعہ اور فعل میں ترتیب مقصود نہیں ہے، جیسا کہ حسب ذیل آیات میں بھی ہے:

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم	کہو (اے پیغمبر) کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں
ان لا تشرکوا به شیئا وبالوالدین	پڑھکر سناؤں جو تمھارے پروردگار نے تم پر
احسانا ...... ثم آتینا موسی	حرام کی ہیں، یہ کہ کسی چیز کو خدا کا شریک مت
الکتاب الخ (انعام)	ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ سلوک کرتے رہو
	..... ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی۔

نیز فرمایا:-

ولقد خلقناکم ثم صورناکم	اور ہم نے تم کو (یعنی تمھارے باپ آدم کو)
ثم قلنا للملئکة اسجدوا لآدم	پیدا کیا اور پھر تمھاری شکل بنائی، پھر ہم نے
(اعراف)	فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھکو۔

ایک شاعر کہتا ہے:-

قل لمن ساد ثم ساد ابوہ ثم قد ساد قبل ذلک جدہ
(ج ۲ ص ۸)

حرف کلا کے متعلق لکھتے ہیں:-

"یہ نفی والباد کا کلمہ ہے، کبھی وہ اَلا کے معنی میں ابتداء کلام میں تنبیہ کیلئے بھی آتا ہے
قرآن عزیز میں اس کی متعدد مثالیں ہیں، امام ابوبکر ابن الانباری نے اس کی تمام قسموں

اور ان کے مواقع استعمال کو کتاب الوقف والابتداء کے ایک باب میں جمع کر دیا ہے،
ایک حدیث [من کذب علی متعمدا لیضل به فلیتبوأ مقعده من النار]
کے متعلق رقمطراز ہیں:-

"ابو جعفر طحاوی کا بیان ہے کہ اس حدیث میں لیضل بہ زائد معلوم ہوتا ہے لیکن اگر
یہ زائد نہ ہو بلکہ روایت کا جز ہو تو اس کی وہی نوعیت ہوگی جو قرآن مجید کی اس آیت میں ہے:

فمن اظلم ممن افتری علی	تو اس شخص سے بڑھکر ظالم اور کون ہوگا جو
الله کذبا لیضل الناس	لوگوں کے گمراہ کرنے کے لیے بے سمجھے بوجھے
(انعام)	خدا پر بہتان باندھے۔

یہاں لام تعلیل کے بجائے صیرورت اور عاقبت کا ہے، مفہوم یہ ہوگا کہ اس کے کذب کا
نتیجہ اور انجام گمراہی ہے، جیسا کہ دوسری جگہ ہے

فالتقطه آل فرعون لیکون	تو فرعون کے لوگوں نے انھیں اٹھالیا کہ
لهم عدوا وحزنا (قصص)	(آخر کار یہی موسیٰ) ان کے دشمن اور پریشانی
	(کے باعث) ہوں۔

قرآن مجید اور کلام عرب میں اس کے بے شمار نظائر موجود ہیں۔
لغت اور نحو کی طرح صرف و اشتقاق اور الفاظ کی تذکیر و تانیث، مفرد و جمع اور تثنیہ
کے متعلق بھی مفید معلومات بیان کیے گئے ہیں۔

بعض اعتراضات

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کو شافعیت میں غلو تھا، اس لیے وہ
مذہب شافعی کو شرح میں زیادہ اہتمام سے نقل کرتے ہیں، اور اسی کو قوی اور مرجح بھی
قرار دیتے ہیں، مگر نووی کے حامیوں نے اس الزام کو سراسر غلط قرار دیا ہے، چنانچہ

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں :-

ومنزه بود از تعصبِ شافعیت و متصف	شافعی مذہب کی عصبیت سے پاک اور
بانصاف ونقل میکرد در کتبِ خود از	انصاف پسند تھے ، اور اپنی کتابوں میں
اقوال ابو حنیفہ	امام ابو حنیفہ کے اقوال و مسالک بھی
(اتحاف النبلاء)	بیان کرتے ہیں ،

اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے فقہی مذہب کا ذکر زیادہ اہتمام سے کرتے ہیں ، اور عموماً اسی کو مرجح بھی ثابت کرتے ہیں ، ممکن ہے زمانہ کے عام اثر کی وجہ سے ان میں یک گونہ عصبیت بھی رہی ہو ، تاہم ان میں رواداری اور حق پسندی بھی تھی ، اس لیے وہ اپنے مرجح مسلک کے دلائل و شواہد بھی بیان کرتے ہیں ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ ہی کسی مسلک کے قوی اور ضعیف ہونے کے قائل رہے ہوں گے . وہ دوسرے ارباب مذاہب اور ائمۂ فقہ کے مسالک نقل کرنے سے اغماض بھی نہیں برتتے ، مشہور فقہائے صحابہ و تابعین اور ائمۂ ثلاثہ کے علاوہ انھوں نے فقہائے امصار کے مذاہب بھی نقل کیے ہیں ، بلکہ انکی وسیع النظری اور رواداری نے فرق ضالہ ، خوارج ، معتزلہ اور روافض کے مذاہب و اقوال نقل کرنے سے انکو باز نہیں رکھا ہے اس لیے وہ ان کے اقوال ذکر کرکے انکی تردید کرتے ہیں ،

ممکن ہے یہ اعتراض بھی کیا جائے کہ وہ اکابر اور ائمہ کی عظمت و احترام کے زیادہ قائل نہ تھے ، اسی لیے وہ انکے خیالات سے بے اطمینانی ظاہر کرتے اور ان پر تنقیدیں کرتے ہیں ، مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ کسی پر تنقید نہ تو اس کی عظمت و احترام کے منافی ہے اور نہ ہی اسکا تنقیص سے کوئی واسطہ ہے ، علامہ نووی کی تنقیدیں عموماً اعتدال پر مبنی ہوتی ہیں ، انھوں نے جن لوگوں کے نقطۂ نظر کی تردید کی ہے انکی عظمت و جلالت کے بھی وہ پوری طرح قائل تھے ، امام مسلم کے بارہ میں انکے طرز عمل سے اسکا اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ

وہ ان پر نقد کرنے کے باوجود ان کا احترام بھی پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں ، اور کبھی کوئی بات ادب احترام کے منافی نہیں تحریر فرماتے ، عام اکابر کی عظمت و احترام کا ان کو جس قدر لحاظ تھا ، اسکا اندازہ مندرجۂ ذیل اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے :-

"حدیثیں لکھنے والے کو اللہ کے نام کے ساتھ عز وجل ، تعالیٰ ، سبحانہ و تبارک و تعالیٰ ، جل ذکرہ ، تبارک اسمہ ، جلت عظمتہ وغیرہ لکھنا چاہئے ، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ مکمل صلے اللہ علیہ وسلم لکھنا چاہیے ، اس میں نہ تو کسی طرح کی کمی کرنی چاہیے اور نہ ہی محض اشارہ پر اکتفا کرنا چاہیے ، ایسے ہی صحابی کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھنا چاہیے ، نیز تمام علماء و صلحاء کے ناموں کے ساتھ رضی اللہ عنہ یا رحمہ اللہ لکھنا چاہیے ، خواہ یہ اس اصل کے اندر ہوں یا نہ ہوں جس سے وہ نقل کر رہا ہے ، کیونکہ ان کا نفس روایت سے کوئی تعلق نہیں ہے ، بلکہ ان کی نوعیت تو دعائی ہے ، کاتب ہی کی طرح پڑھنے والے کو بھی ان لوگوں کے ناموں کے ساتھ ترضیہ و ترحیم کا لحاظ رکھنا چاہئے ، چاہے وہ اصل کے اندر ہو یا نہ ہو ، ان کی تکرارات اکتانے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ، جو شخص اس معاملہ میں غفلت سے کام لے گا وہ بڑے خیر و برکت سے محروم رہے گا ۔"

ایک جگہ ایک بزرگ راوی ابو بکر بن عیاش کے کئی ہزار بار قرآن ختم کرنے کے واقعات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

"ان بزرگوں کے جن کے ذکر سے رحمت الٰہی کا نزول ہوتا ہے ، اس طرح کے عجیب و غریب اور حیرت انگیز واقعات پر رد و انکار نہیں کرنا چاہئے ، کیونکہ اگر کوئی شخص اس طرح کے خیال پر قائم رہا تو یہ اس کے عدم فلاح کی علامت ہے ، اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے فضل و احسان سے اپنی اطاعت کی توفیق دے ۔"

لبید بن ربیعہ

(ایک جاہلی شاعر)

از جناب مولوی عبدالحلیم صاحب ندوی، ایم، اے، علیگ، استاذ عربی ادب، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

ابو عقیل لبید بن ربیعہ وہ نامور جاہلی شاعر ہے جس نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں اپنی عمر کا ایک معتدبہ حصہ گزارا، لبید نے اپنی قوم کے وفد کے ساتھ اسلام قبول کیا، اور مسلمان ہوتے ہی اس کی ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ باقی عمر قرآن اور اسلام ہی کا ہو کر رہ گیا، شعر و شاعری ترک کر دی اور بڑی پاک باز، صاف ستھری اور باوقار زندگی گزاری۔ اس کی عظمت و عزت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کہ اس کا چرچا جاہلیت کے بزمہائے طرب اور خوش باش اور زندہ دل نوجوانوں کی محفلوں ہی میں نہیں رہتا تھا بلکہ بڑے بوڑھوں کی پر وقار انجمنوں اور مجلسوں میں بھی اس کا نام عزت و وقار سے لیا جاتا تھا، اور جب وہ اسلام لایا تو شاید حضرت حسانؓ کے بعد وہ پہلا شاعر ہے جس کا ذکر کوفہ کی مسجد کے منبروں پر ہوا۔ اور خود گورنر نے اس کی مدد کرنے اور اس کی قسم کو نبھانے میں پہل کی، اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی، اس کی قسم یہ تھی کہ جب بھی باد صبا چلے گی میں لوگوں کو کھانا کھلاؤں گا،[1]

لبید بنو عامر کا شاعر، ان کا مشہور شہسوار، ان کے ناموس کا نگہبان، اور ان کی شہرت

[1] اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

و عزت کا نشان تھا، اس کا سلسلۂ نسب قبیلۂ مضر سے ملتا ہے[2]، لبید کا باپ ربیعہ بڑا فیاض اور سخی داتا تھا، اس کی غربا پروری، دادرسی، دریا دلی اور داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ لوگ اسے "ربیعۃ المقترین" یعنی "دکھیاروں کا ربیعہ" کے نام سے پکارتے تھے[3]، اس کی ماں خاندان عبس کی لڑکی تھی اور اس کا نام "تاموۃ بنت زنباع" تھا، لبید نے زمانۂ جاہلیت میں آنکھیں کھولیں لیکن اتنی لمبی عمر پائی کہ انتقال حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت یعنی سنہ ۴۱ھ مطابق ۶۶۲ء میں ہوا،[4]

جاہلی زمانے کے شعراء میں لبید کو کئی چیزوں میں امتیازی شان حاصل ہے، ایک طرف اسے شریف النفس، سلیم الطبع، پاکیزہ فکر و نظر، حق بیں و حق گو، کہنہ مشق، قابل تقلید بدوی شاعر سمجھا جاتا تھا تو دوسری طرف اسے بہادری اور شجاعت میں یکتائے زمانہ مانا جاتا تھا، یہاں تک کہ لوگ اسے فتی العرب یعنی "شیر عرب" کے نام سے یاد کرتے تھے، ان صفات کے ساتھ ساتھ سخاوت، دریا دلی اپنے چچا سے ورثہ میں ملی تھی اور معرکۂ کارزار میں اس کو تلوار کے جوہر دکھانے کا فن اور شہسواری کا گر "ملاعب الاسنۃ" سے ملا تھا، جو زمانۂ جاہلیت کا مشہور بہادر اور دلیر شاعر تھا، اور رشتہ میں اس کا چچا[5]، یہ عجیب اتفاق ہے کہ "ملاعب الاسنۃ" کا ایک موقع پر سکوت اور اپنے حریف کے مقابلہ میں اس کی شکست لبید کی شاعری کا پیش خیمہ اور اس کی شہرت کا سبب بن گئی،

[2] پورا سلسلۂ نسب یہ ہے: لبید بن ربیعہ بن عامر بن مالک بن جعفر بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ

[3] ربیعہ بنو اسد کے ہاتھوں ایک لڑائی میں مارا گیا تھا، ربیعہ کے بھائی عامر بن مالک نے اس کے قاتل کو قتل کر کے بدلہ لیا (الشعر والشعراء: ابن قتیبہ صہ ۱۵۱) [4] تاریخ انتقال کے سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے راجح وہی ہے جو ہم نے لکھا ہے۔ [5] "ملاعب الاسنۃ (یعنی نیزوں سے کھیلنے والا) کا نام عامر بن مالک ہے "ملاعب الاسنۃ" اس کا نام اوس بن حجر کے اس شعر کی وجہ سے پڑا ـــ

ولاعب اطراف الاسنۃ عامر فراح لہ حظ الکتیبۃ اجمع

اس کا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے اپنے قبیلہ بنو عامر اور اس کے ننہال کے قبیلہ عبس میں سخت دشمنی تھی، ایک دفعہ نعمان بن المنذر کے دربار میں دونوں قبیلوں کی مڈبھیڑ ہو گئی، اس موقع پر عبس قبیلہ کا سردار الربیع بن زیاد اور عامریوں کے وفد کا لیڈر لبید کا چچا "ملاعب الاسنۃ" ربیع، نعمان بن منذر کے بہت منھ چڑھا تھا، ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا، اسی کے ساتھ کھاتا پیتا اٹھتا بیٹھتا تھا، اس نے عامریوں کی ... طرف سے نعمان بن المنذر کے کان بھر رکھے تھے، چنانچہ جب قبیلہ بنو عامر کا وفد اس کے دربار میں آیا تو اس نے منھ پھیر لیا، اور بہت ذلت آمیز سلوک کیا "ملاعب الاسنۃ" اس کی کچھ کاٹ نہ کر سکا، یہ بات عامریوں کو بہت بری لگی، اور وہ غصے میں بھرے ہوئے اس کے دربار سے اٹھ کر چلے آئے، اور اگلے قدم کے بارے میں آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ لبید اس وقت بہت چھوٹا تھا، اور اس کے ذمہ وفد کے اونٹوں کو چرانے کا کام تھا، جب اس نے دیکھا کہ سارے لیڈر اور بوڑھے بیٹھے کچھ مشورہ کر رہے ہیں، تو اس نے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے، لوگوں نے اس کی کم عمری کی وجہ سے اس کی بات پر دھیان نہ دیا، مگر جب اس نے بہت اصرار کیا اور قسم کھالی کہ اگر آپ لوگ مجھے نہ بتائیں گے تو نہ میں آپ کے اونٹوں کو چراؤں گا اور نہ ان کی دیکھ بھال اور رکھوالی کروں گا، تب لوگوں نے بادشاہ نعمان کے حقارت آمیز سلوک کا ذکر کیا اور کہا کہ تمہارے ماموں الربیع کا یہ سب کیا دھرا ہے، اس پر لبید نے کہا کہ آپ لوگ اجازت دیں تو میں اس کو ایسا جواب دوں کہ وہ بھی یاد کرے، اور نعمان ہمیشہ کے لئے اس کی صورت سے متنفر ہو جائے، لوگوں نے کہا کہ ہم تمہیں اس طرح اجازت نہ دیں گے پہلے تم اپنی صلاحیت کا ثبوت دو، تب اجازت ملے گی، لبید نے کہا کہ آپ لوگ امتحان لے لیجیے اتفاق سے سامنے زمین پر ایک سوکھا ننھا سا پودا لگا تھا، اس میں گنتی کے چند

پتے باقی رہ گئے تھے، جسے عربی میں "التربۃ"[1] کہتے ہیں، ان بزرگوں نے کہا، اس پودے کی ہجو کر دو تو جانیں، لبید نے اس کی ایسی ہجو کی، جو مضحکہ خیز ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی زباں دانی کا بھی بہت اچھا ثبوت تھا، اس نے کہا "ہذہ التربۃ لاتذکی ناراً ولا تؤہل داراً ولا تسر جاراً عودہا ضئیل وخیرہا قلیل وفرعہا کلیل، اقبح البقول مرعی واقصرہا فرعاً، واشدہا قلعاً فحزیا لجارہا وجدعا۔ القوا بی اخا عبس ارجعہ عنکم بتعس ونکس واترکہ من امرہ فی لبس[2] یعنی یہ تربہ کا پودا اتنا حقیر اور بودا ہے، کہ اس سے نہ تو آگ ہی روشن ہو سکتی ہے، اور نہ یہ کسی گھر کی زینت ہی بن سکتا ہے اور نہ اسے دیکھ کر کسی پڑوسی کو خوشی ہو سکتی ہے، اس کا تنا بہت ہی پتلا اور اس کا فائدہ بہت ہی کم، اور اس کی شاخ بالکل ہی کمزور ہے، چرے جانے والوں (پودوں) میں سب سے بدتر، شاخوں کے لحاظ سے سب سے چھوٹا، اور اکھاڑنے میں سب سے سخت ہے، جو اس کے پڑوس میں رہے، اس کا ستیاناس جائے، مجھے اس عبس سے ملا دو میں اسے اتنا ذلیل و خوار کر دوں گا، کہ وہ پھر تمہارے مقابلہ میں کبھی نہ آسکے گا، اور اپنے معاملہ کے گورکھ دھندے ہی میں پڑا سڑتا رہے گا۔

جب بزرگوں نے اس کی یہ طلاقت لسانی دیکھی تو کہا کہ بیشک تم اس مہم کے لائق ہو پھر انھوں نے اس کے بال منڈوائے، اور دو جوتیاں چھوڑ دیں، اور ایک خاص قسم کا لباس پہنا کر اس کو لے کر النعمان بن المنذر کے دربار میں پہونچے، نعمان اس وقت دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا، اور دسترخوان پر اس کے ساتھ صرف الربیع بن زیاد تھا، مختلف وفدوں سے دربار بھرا ہوا تھا، جب نعمان کھانا کھا چکا، تو لبید کے قبیلہ کے لوگوں کو حاضری کی اجازت دی جب یہ لوگ اس کے سامنے اپنی ضرورتیں بیان کرنے لگے، تو اس کے پہلو میں الربیع بھی کھڑا تھا، اس نے

---

[1] بعض کتابوں میں "التربۃ" بھی آیا ہے، [2] اسکے یہ جملے کمی زیادتی کے ساتھ مختلف طریقوں سے مروی ہیں،

ان کی بات کاٹ دی، اس وقت لبید اپنی اس ہیئت کذائی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا، سب کی نگاہیں اس کمسن لڑکے اور پھر اس کی مضحکہ خیز ہیئت کذائی کی طرف اٹھ گئیں، اس نے سب کے سامنے ربیع بن زیاد کی ایسی سخت اور فحش ہجو کی کہ نعمان کو کہنا پڑا کہ "اس لونڈے کا ستیاناس جائے، اس نے اس گندی باتوں سے میرے کھانے کا سارا مزہ بے لطف کر دیا" اس کی ہجو کا پہلا شعر یہ تھا:-

یا رب ہیجا ہی خیر من دعہ   اذ لا تزال ھامتی قنزعہ

آگے چل کر کہتا ہے:

فلا ابیت اللعن لا تاکل معہ یعنی "چشم بد دور" ایسے آدمی کے ساتھ ہرگز کھانا نہ کھایا کیجیے، اور اس کی وجہ بہت گندی بتائی ہے[1]

نعمان نے اس کے بعد عامریوں یعنی لبید کے قبیلہ کے وفد کی ضرورتیں پوری کر دیں اور الربیع سے پوچھا، کیا تم ایسے ہی ہو جیسا کہ اس لڑکے نے بیان کیا ہے، وہ بولا، یہ لڑکا جھوٹا اور احمق ہے، اور کھسیا کر اپنے گھر چلا گیا، اور النعمان کو لکھ بھیجا کہ آپ کسی آدمی کو میرے پاس بھیج دیجئے کہ اس نے میرے متعلق جو باتیں کہی ہیں، وہ کہاں تک صحیح ہیں مگر نعمان نے کہلا بھیجا کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، قد قیل

ما قیل ان صدقا وان کذبا   فما اعتذارک من قول اذا قیلا

اس واقعہ کے بعد لبید کی زبان چل پڑی، اور اس کے جذبات شاعری ابل پڑے، اور اس کا شہرہ سارے علاقے میں پھیل گیا اور اس نے اس کے بعد چھوٹے بڑے کئی قصیدے کہے، جن سے اس کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔

لبید بن ربیعہ کی دلیری، بہادری اور شہسواری میں یکتائی کے سلسلہ میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ الحارث الاعرج الغسانی نے ایک سو بہادر نوجوانوں کا ایک جتھا لبید کی سرکردگی میں حیرہ کے

[1] ہجو کے ان اشعار کے لیے دیکھئے الاغانی ج ۱۴۔ المعلقات الشعر والاخبار فالیہا اللاہین، المستقصی اور تذکرہ کی دوسری کتابیں۔

کے بادشاہ المنذر بن ماء السماء کو قتل کرنے کے لئے بھیجا، ان لوگوں نے اس کے پاس جا کر ظاہر کیا، کہ وہ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری قبول کرنے کے لئے آئے ہیں، چنانچہ اس نے انھیں اپنے پاس رکھ لیا، یہ لوگ موقع کی تلاش میں رہے، اور ایک دن موقع پا کر اسے قتل کر دیا، اور بھاگ کھڑے ہوئے منذر کے لشکر نے ان کا پیچھا کیا، اور بہتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، لیکن لبید نے اپنے گھوڑے کو ایسی ایڑ لگائی کہ لاکھ کوشش کی اس کو پکڑ نہ سکے، اور وہ صاف بچ کر نکل گیا، اور غسان کے بادشاہ کے پاس جا کر سارا قصہ سنایا، اور غسانیوں نے منذر کے لشکر پر چڑھائی کر دی، اور انھیں سخت شکست دی، اس جنگ کو "یوم حلیمہ" کہتے ہیں[1]

اغانی نے اصمعی اور ابن الکلبی کی سند سے روایت کی ہے کہ جب اسلام کا ظہور ہوا، اور عرب کے وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آنے لگے، تو بنو جعفر بن کلاب کا وفد بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس میں لبید بن ربیعہ بھی تھا، وہ وفد کے ساتھ آپ کے ہاتھوں اسلام لایا اور وطن جا کر قرآن شریف حفظ کیا، اس کے بعد بڑی پاک اور صاف ستھری اسلامی زندگی گزارنے لگا، شعر و شاعری بالکل ترک کر دی، روایت ہے کہ لبید بن ربیعہ نے اسلام لانے کے بعد صرف ایک شعر کہا تھا جو یہ تھا:

ما عاتب الحر الکریم کنفسہ   والمرء یصلحہ الجلیس الصالح

ابن قتیبہ نے ابو الیقظان سے روایت کی ہے کہ اسلام لانے کے بعد پہلا اور آخری شعر یہ تھا

الحمد للہ اذ لم یاتنی اجلی   حتی اکتسبت من الاسلام سربالا

[1] اس جنگ میں غسانی بادشاہ کی لڑکی بھی شریک تھی، چنانچہ اس کے نام پر اس کو "یوم حلیمہ" کہتے ہیں ابن قتیبہ نے الشعر والشعراء میں روایت کی ہے کہ حلیمہ نے بہادروں کو اپنے ہاتھ سے زرہیں اور خود پہنائے تھے، اور دلداری و دلجوئی کی تھی، ص ۱۴۸۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں لبید کوفہ میں منتقل ہو کر وہیں رہ بس گئے، ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ کو لکھا کہ تمھارے علاقے کے شعرا نے اسلام لانے کے بعد جو شعر کہے ہیں، انھیں لکھ بھیجو، انھوں نے سب سے پہلے اس علاقے کے مشہور شاعر الاغلب الراجز العجلی کو بلوا کر کہا کہ مجھے اپنے اشعار سناؤ، اس نے کہا:

ارجزاً تريد ام قصيداً لقد طلبت هينا موجوداً

یعنی آپ رجز سننا پسند فرمائیں گے، یا قصیدہ۔ آپ نے تو انتہائی آسان چیز کی فرمائش کی ہے،

اسکے بعد لبید بن ربیعہ کو بلوا بھیجا، اور حضرت عمرؓ کا حکم سنا کر شعر پڑھنے کی فرمائش کی، لبید نے کہا کہ "ان شئت ما عفی عنہ" یعنی اگر آپ چاہیں تو میں وہ شعر سناؤں جو اب مٹ چکے ہیں، مطلب یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت کا کلام سناؤں؟ مغیرہ نے کہا، نہیں، اسلام لانے کے بعد جو کچھ کہا ہے وہ سناؤ، لبید نے کہا، تھوڑی سی مہلت دیجئے، یہ کہہ کر اٹھے اور ایک کاغذ پر سورۂ بقرہ لکھ کر لے آئے اور اس کو پیش کر کے بولے کہ اللہ نے شعر کے بدلے میں مجھے یہ عنایت فرما دیا ہے، جو حاضر ہے،

مغیرہ نے اس واقعہ کی اطلاع حضرت عمرؓ کو دی، آپ نے اغلب کے وظیفے میں سے پانچ سو درہم کم کر کے لبید کے وظیفہ میں بڑھا دیئے، اور ان کا وظیفہ دو ہزار پانچ سو درہم ہو گیا، اغلب کو جب اس کی خبر ہوئی، تو اس نے حضرت عمرؓ کو درخواست دی، کہ آپ نے میرا وظیفہ صرف اس لئے کم کر دیا کہ میں نے آپ کی اطاعت کی تھی؟ اس درخواست پر حضرت عمرؓ نے اس کے پانچ سو پھر بحال کر دیئے اور لبید کو بڑھی ہوئی رقم کے ساتھ وظیفہ ملتا رہا، حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے زمانے میں لبید کے پانچ سو درہم کم کرنا چاہے، انھوں نے کہا کہ میں تو چراغ سحری ہو رہا ہوں، آج مرا کل دوسرا دن، حضرت معاویہؓ نے یہ سن کر وظیفہ برقرار رکھا، لیکن کہتے ہیں کہ لبید اس واقعہ کے بعد مر گئے، اور وظیفہ لینے کی نوبت نہ آئی[1]

---

[1] ابن سلام الجمحی نے نقل کیا ہے کہ لبید نے حضرت معاویہؓ سے کہا "اوندعنی فلیلا ثم تضم عطائی الی عطائک فاخذہ" (الجمع صہ ۱۳۱)

جیسا کہ پہلے بیان ہوا، سخاوت اور غربا پروری لبید کو اپنے باپ "ربیعۃ المقترین" سے ورثہ میں ملی تھی، انھوں نے زمانہ جاہلیت میں قسم کھا رکھی تھی، کہ جب جب باد صبا چلے گی، وہ لوگوں کو کھانا کھلائیں گے، انھوں نے اس نیک کام کو انجام دینے کے لئے دو دیگیں بنوا رکھی تھیں، اور جب باد صبا چلتی اس میں کھانا پکوا کر صبح اور شام اپنے قبیلہ کی مسجد میں لے جاتے، اور سب کو کھانا کھلاتے، لبید نے اس منت کا ذکر اپنے معلقہ میں بھی کیا ہے،

راویوں کا بیان ہے کہ جب باد صبا چلتی تھی، تو حضرت عمرؓ کی طرف سے متعین کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ لوگوں سے کہتے تھے، کہ ابو عقیل کی مروت اور شجاعت و شرافت کی وجہ سے ان کی اس موقع پر مدد کریں، تاکہ وہ اپنی منت پوری کر سکیں،

ایک دفعہ جب کہ الولید بن عقبہ کوفہ کے گورنر تھے، باد صبا چلی، یہ زمانہ لبید کے بڑھاپے اور انتہائی تنگ دستی کا تھا، ولید کو اس کی خبر تھی، چنانچہ وہ منبر پر چڑھے، اور لوگوں سے کہا، کہ تمھارے بھائی لبید نے زمانۂ جاہلیت میں قسم کھائی تھی، کہ جب بھی باد صبا چلے گی، وہ لوگوں کو کھانا کھلائیں گے، آج باد صبا چلی ہے، اس لئے آج کا دن ان کے اس نیک کام کا دن ہے، آپ لوگ اس نیک روایت کو برقرار رکھنے میں ان کی مدد کیجئے، اور اس کام میں میں پہل کرتا ہوں، اور منبر سے اتر کر لبید کے پاس ایک سو اونٹوں کی بچھڑیاں بھیجیں اور اس کے ساتھ اشعار لکھ بھیجے

ارى الجزار يشحذ شفرتيه اذا هبت رياح ابى عقيل

اشم الانف اصيد عامرى طويل الباع كالسيف الصقيل

وفى ابن الجعفرى بحلفتيه على العلات والمال القليل

بنحر الكوم اذ سحبت عليه ذيول صبا تجاوب بالاصيل

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابو عقیل کی ہوائیں (باد صبا) چلتی ہیں، تو میں دیکھتا ہوں کہ قصاب

اپنے چھروں کو تیز کر رہا ہے تاکہ یہ معزز اور محترم سخی داتا قبیلۂ عامر کا فرد اپنی قسم پوری کر سکے، اور یہ واقعہ ہے کہ اس نے باوجود تنگ دستی اور تھوڑے سے مال کے اپنی قسم کو موٹی تازی اونٹنیوں کو ذبح کر کے پوری کی، جب کہ باد صبا سر شام چل پڑی،

لبید یہ اشعار پڑھکر اپنی لڑکی سے کہا، بیٹی تم تو جانتی ہو کہ میں نے اب شعر کہنا بالکل چھوڑ دیا ہے، اس لئے تم ہی ان کا جواب دیدو

لڑکی نے جواب میں یہ شعر کہے :-

اذا ھبت ریاح ابی عقیل ذکرنا عند ھبتھا الولیدا

اشم الانف اصید عبشمیا اعان علی مروتہ لبیدا

بامثال الھضاب کان رکبًا علیھا من بنی حام قعودًا

ابا وھب جزاک اللہ خیرا نحرناھا فاطعمنا الثریدا

فعد ان الکریم لہ معاد وظنی یا ابن اروی ان یعودا

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابوعقیل کی ہوا (باد صبا) چلی تو ہم نے مدد کے لئے ولید کو یاد کیا، جو عالی خاندان کا فرد اور معزز و مکرم شخص ہے، اس نے لبید کی مدد بھاری بھرکم، موٹی تازی اونٹنیاں بھیج کر کی، اے ابو وھب! خدا تمھیں جزائے خیر دے، ہم نے ان کو ذبح کر کے ثرید بنا کر سب کو کھلا دیا، اور ہمیں امید ہے کہ تم آئندہ بھی ایسا ہی کرتے رہوگے،

لبید نے سنکر کہا، تم نے بہت اچھا کیا ہے، صرف یہ خرابی ہے، کہ تم نے اس سے مزید کی خواہش کی ہے، بیٹی بولی، کہ خدا کی قسم میں نے تو صرف اس لئے مانگا ہے کہ وہ حکمراں ہیں، اگر وہ کوئی بازاری آدمی ہوتے، تو ہرگز نہ مانگتی،

لبید نے بڑی لمبی عمر پائی، جب ۷۰ سال کا ہوا، تو اس نے کہا :-

باتت تشکی الی النفس مجھشتہ وقد حملتک سبعًا بعد سبعینا

فان تزادی ثلاثا تبلغی املا وفی الثلاث وفاء للثمانینا

اور جب نوّے [۹۰] سال کا ہوا تو اس کی یادگار میں یہ شعر کہا :-

کانی وقد جاوزت تسعین حجتہ خلعت بھا عن منکبی ردائی

نوّے کو پار کر کے جب ایک سو دس سال کی عمر ہوئی تو کہا کہ ع

الیس فی مائۃ قد عاشھا رجل وفی تکامل عشر بعدھا عمر

اور جب ایک سو بیس [۱۲۰] سال پورے کر لئے تو زندگی سے اکتا کر کہا :-

ولقد سئمت من الحیاۃ وطولھا وسوال ھذا الناس کیف لبید

حضرت امام مالکؒ سے روایت ہے کہ لبید نے ایک سو چالیس [۱۴۰] سال کی عمر میں وفات پائی اور بعض لوگوں کا خیال ہے، کہ ایک سو ستاون [۱۵۷] سال کی عمر پائی، اس پر تقریبًا سب کا اتفاق ہے، کہ حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں سنہ ۴۰ھ یا ۴۱ھ میں لبید کا انتقال ہوا، اور اپنے خاندان کے صحرا میں دفن ہوا،

اغانی اور ابوزید القرشی کی روایت ہے کہ جب لبید کا آخری وقت آیا، تو اس نے اپنے لڑکے [۱] کو بلایا، اور کہا کہ جب تمھارا باپ مر جائے، تو اس کی آنکھیں بند کر کے اس کا منہ قبلہ کی طرف کر دینا، اور ایک کپڑے سے اُسے ڈھانپ دینا، اور کسی رونے والی اور بین کرنے والی کو نالہ و شیون کی اجازت نہ دینا، دونوں دیگوں میں اچھا کھانا پکا کر اپنی مسجد میں ان لوگوں کو کھلانا، جو میری زندگی جب وہ لوگ کھانے سے فارغ ہو جائیں، تو کہنا کہ اپنے بھائی لبید کے جنازہ کی نماز

---

[۱] مراد بھتیجہ ہے، کیونکہ لبید کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، مگر ابن سعد نے طبقات میں روایت کی ہے، کہ لبید کے لڑکے تھے، جو لبید کے مرنے کے بعد کوفہ سے بادیہ میں واپس آ گئے تھے،

پڑھتے جائیے، اس کے بعد چند شعر پڑھے[1]، جن کا ذکر اہم کتابوں میں ہے،

کلام کی خصوصیات | لبید نے چونکہ جاہلی اور اسلامی دونوں کا زمانہ پایا، اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دست مبارک پر اسلام لائے، اس لئے قاعدے کے مطابق ان کو "مخضرمین" میں شامل کرنا چاہیئے تھا، لیکن تذکرہ نگاروں نے جاہلی دور کے ممتاز شعراء میں شمار کیا ہے، کیونکہ اسلام لانے کے بعد صحیح روایتوں کے مطابق انھوں نے صرف ایک شعر کہا تھا، جو پہلے گذر چکا ہے، اگرچہ مسلمان ہونے کے بعد وہ تقریباً چالیس سال زندہ رہے، مگر شعر و شاعری بالکل نہ کی، برخلاف حضرت حسان بن ثابت کے، جنھوں نے جاہلیت کے زمانہ میں بھی شاعری کی، اور اسلامی دور میں بھی یہ شغل جاری رکھا، اس لئے انھیں مخضر میں شمار کیا جاتا ہے،

لبید نے شعر و شاعری کی ابتدا بہت ہی کم سنی میں کر دی تھی، اور اس زمانے میں خاصی شہرت بھی حاصل کر لی تھی، شاعری کے میدان میں وہ اپنے پیش رو آزاد منش عالی نسب اور اولو العزم شاعروں جیسے عنترہ بن شداد العبسی اور عمرو بن کلثوم کی پیروی کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے کبھی شاعری کو اپنی روزی کا ذریعہ نہیں بنایا، اور نہ انعام و اکرام کے لئے مدحیہ قصیدے کہے، اس لئے ان کا کلام بہت بلند ہے، اور پسندیدہ فخر کے علاوہ بہادری، دوسروں کی امداد، فیاضی، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک اور رواداری وغیرہ اخلاق حمیدہ کی تلقین سے معمور ہے، اس قسم کی تعلیمات ان کے معلقہ میں خاص طور سے ملتی ہے، لبید کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے بہت ہی پرشکوہ مگر خوبصورت الفاظ کا انتخاب کرتے تھے، اور ان کو نظم کے قالب میں اس طرح ڈھالتے تھے، کہ عبارت کا حسن، دقیق معانی، بلند اور پاکیزہ خیالات ہم آہنگ ہو کر شاہکار بن جاتے تھے، دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے، کہ ان کے کلام میں شاعرانہ مبالغہ آرائی زیادہ نہیں ہے

---

[1] جمہرۃ "اشعار العرب" لابی زید القرشی اور الاغانی ابو الفرج الاصفہانی جلد ۱۴۔

وہ عام طور سے ایمان، عقیدہ، حکمت و فلسفہ اور پند و نصیحت کے مضامین پر مشتمل ہے، خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کی حق گوئی کی شہادت دی ہے، بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ سب سے سچی بات جو کسی شاعر نے کہی ہے، وہ لبید کا یہ قول ہے" الا کل شیٔ ما خلا اللہ باطل[1]"

ان خصوصیات کے علاوہ لبید کو مرثیہ گوئی میں بھی امتیازی حیثیت حاصل ہے، مرثیہ میں وہ حکمت اور دانائی کی ایسی باتیں کہتا ہے، جن سے رنج و غم ہلکا ہو جاتا ہے، اور صبر و سکون ملنے لگتا ہے،

ابن سلام الجمحی نے اپنی کتاب "طبقات فحول الشعراء" میں لبید کو جاہلی شعراء کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے، اور اسے النابغۃ الجعدی، ابو ذویب الھذلی اور الشماخ بن ضرار کا ہم پلہ قرار دیا ہے[2]، اور یہ خیال ظاہر کیا ہے، کہ لبید کا کلام شماخ کے کلام کے مقابلہ میں زیادہ عام فہم اور آسان ہے، کہتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی نے لبید سے پوچھا، کہ عربوں میں سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ لبید نے جواب دیا کہ "الملک الضلیل" یعنی امرأ القیس، پھر سوال کیا، کہ اس کے بعد کون؟ جواب دیا "الغلام القتیل" (مقتول لڑکا) یعنی طرفۃ العبد پھر پوچھا، اس کے بعد؟ لبید نے کہا، "الشیخ ابو عقیل" یعنی خود میں،

ایک دفعہ نابغہ الذبیانی نے النعمان بن المنذر کے دربار میں لبید سے شعر سنانے کی فرمائش کی، انھوں نے اپنا وہ قصیدہ سنایا جس کا مطلع ہے ع

الم تلمم علی الدمن الخوالی لسلمی بالمذانب فالقفال

نابغہ نے سنکر کہا، کہ قبیلہ بنو عامر میں تم سب سے بڑے شاعر ہو، کچھ اور سناؤ، لبید نے وہ قصیدہ پڑھا جس

---

[1] اس شعر کے بارے میں ایک عجیب قصہ بیان کیا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ عثمان بن مظعون ایک دفعہ قریش کی ایک مجلس کے پاس سے گذرے، انھوں نے دیکھا کہ لبید اشعار سنا رہا ہے، چنانچہ جب اس نے یہ مصرع پڑھا کہ "الا کل شیٔ ما خلا اللہ باطل" تو عثمان نے کہا کہ بالکل سچ بات کہی، اور جب دوسرا مصرع پڑھا "وکل نعیم لا محالۃ زائل" تو بولا کہ بالکل جھوٹ، لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ پہلی بات صحیح اور دوسری جھوٹی کیوں ہے، اس نے پھر سے شعر پڑھوایا گیا، اب کی مرتبہ بھی عثمان نے پہلے مصرع کو صحیح

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۳ پر)

کا مطلع ہے :-

طلل لخولۃ بالرسیس قدیم ۔۔۔ بمعاقل فالانعمین وشوم

تو نابغہ بولا کہ تم قبیلہ ہوازن میں سب سے بڑے شاعر ہو، کچھ اور سناؤ، اور جب لبید نے اپنا معلقہ سنایا، جس کا پہلا شعر ہے

عفتِ الدیار محلہا فمقامہا ۔۔۔ بمنیً تابد غولہا فرجامہا

معلقہ سنکر نابغہ جھوم جھوم اٹھا اور فرط مسرت میں کہا کہ جاؤ تم عربوں میں سب سے بڑے شاعر ہو، فرزدق کے متعلق کہتے ہیں، کہ وہ کوفہ میں بنو اقیصر کی مسجد کے پاس سے گذر رہا تھا کہ اس کے کان میں لبید کے اس شعر کی آواز پڑی :-

وجلا السیول عن الطلول کانہا ۔۔۔ زبر تجد متونہا اقلامہا

تو سجدہ میں گر پڑا، لوگوں نے کہا، کہ ابو فراس یہ کیا بدعت ہے ؟ تو بولا کہ تم لوگ صرف قرآن کے سجدے کو جانتے ہو، اور میں شعر کے سجدے کو بھی سمجھتا ہوں،

یوں تو لبید نے بہت سے شگفتہ اور پُرمغز قصیدے کہے ہیں، لیکن اس کی شاعری کا بہترین نمونہ اس کا معلقہ ہے، جس کا مطلع ہے :-

عفت الدیار محلہا فمقامہا ۔۔۔ بمنیً تأبد غولہا فرجامہا

یعنی منی میں (جو طائف کے قریب ہے) میرے محبوب کے ٹھہرنے کی جگہیں مٹ گئی ہیں، اور اس کے دونوں پہاڑ یعنی غول اور رجام ویران و سنسان پڑے ہیں، اس قصیدہ میں بالاتفاق ۸۸ شعر ہیں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۷) اور دوسرے کو جھوٹ کہا، لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیسے ؟ جواب دیا کہ جنت کی نعمتوں کو کبھی زوال نہیں، اس لئے دوسرا مصرع جھوٹ ہے، یہ بات ولید کو بہت بُری لگی، اس نے کہا کہ معزز ین قریش تمہاری مجلسوں میں ایسی باتیں نہیں ہوتی تھیں، یہ واقعہ اسلام سے پہلے کا ہے۔ ۵۳ صفحہ ۱۰۲۔

لبید بدوی شاعر ہے، اس لئے اس کے معلقہ میں بدوی زندگی کی پوری تصویر ملتی ہے، اس کا موضوع شاعر کی اپنی زندگی، اسکی عیش کوشی اور سخاوت اور اس کی بہادری اور شجاعت ہے، اور آخر میں اپنی قوم اور قبیلہ کی تعریف اور اس پر فخر،

دستور کے مطابق اس نے اپنا قصیدہ تشبیب سے شروع کیا ہے جس میں اپنی محبوبہ کے ٹھہرنے کی جگہوں کا ذکر کرتا ہے، اور کہتا ہے، کہ اس کے نشانات مٹ گئے تھے لیکن بارش نے اوپر کی گرد و غبار دھو کر اسے پھر سے ظاہر کر دیا ہے، اور ایسا لگتا ہے، کہ پتھر پر کوئی تحریر کندہ کر دی گئی ہو اور باوجود امتداد زمانہ کے ابھی تک باقی ہے، لیکن یہ بات اسی کو معلوم ہو سکتی ہے، جو قریب سے بہت دیر تک غور سے اسے دیکھتا رہے، پھر دیار محبوب کی ویرانی اور وہاں پر جانوروں کے آزادانہ رہنے کا ذکر کرتا ہے، کیونکہ اب یہاں کوئی انسان نہیں رہتا، جس سے ڈر کر وہ دوسری جگہ بھاگ جائیں اور یہ سلسلہ نویں شعر تک چلتا ہے، دسویں شعر سے غزل کی طرف منتقل ہوتا ہے، اور ان نشانوں کے پاس کھڑے ہو کر اپنی محبوبہ کے متعلق ان سے سوالات کرتا ہے، لیکن پھر خود ہی جواب بھی دیتا ہے، کہ بھلا یہ گونگے سخت جان پتھر میری بات کا جواب دے سکتے ہیں، نہیں یہ محض واہمہ ہے یہاں کوئی نہیں، محبوبہ کا قبیلہ یہاں سے کب کا جا چکا، اور ان جگہوں پر چرندوں اور پرندوں نے اپنے بسیرے بنا لئے ہیں اور اب تو اس کی نشانی نالیاں اور ثمام کے درخت رہ گئے ہیں،

فوقفت اسألہا وکیف سؤالنا ۔۔۔ صماً خوالد مایبین کلامہا

عریت وکان بہا الجمیع فابکروا ۔۔۔ منہا وغودر نؤیہا وثمامہا

اس کے بعد محبوبہ کے کوچ کرنے کا ذکر کرتا ہے، اور اس کا منظر پیش کرتا ہے، اور یہ بتاتا ہے، کہ وہ کن کن جگہوں پر اتری، اور آخر میں اس کے وصال سے مایوس ہو کر اپنے دل کو اس سے قطع تعلق کرنے کے لئے سمجھاتا ہے، اور اس ضمن میں محبت سے متعلق جاہلی شاعر کا نقطہ نظر بتاتا ہے، اگر محبوب دلدار نہیں اس کا

وصل ممکن نہیں، تو اس سے قطع تعلق کر لینا ہی بہتر ہے،

فاقطع لبانۃ من تعرض وصلہ　　　　ولخیر واصل خلۃ صرامھا

غالب نے بھی شاید ان ہی حالات میں کہا تھا۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

غالب تو سر پھوڑنے کے لئے دوسرے کے سنگ آستاں کے متلاشی تھے، لیکن جاہلی شاعر ایسے موقعوں پر اپنی اونٹنی کا سہارا لیتا ہے، وہ سر پھوڑنے کا قائل نہیں، صحرا کی پہنائیوں میں اپنی کشتی بے بادبان کے ذریعہ محبت کی تلاش کا قائل ہے، جہاں نیل گائیں خور گر، شتر مرغ آزادی کی فضا میں بے روک ٹوک محبت کرتے ہیں، چنانچہ وہ اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر صحرا نوردی کے لئے نکل کھڑا ہوتا ہے، یہ اونٹنی مدتوں تک پیہم سفر کرتے رہنے کی وجہ سے بہت لاغر و نحیف ہو گئی ہے، اس کی پیٹھ اور کوہان سوکھ کر کھنکھڑ ہو گئی ہیں، اس کی مہار پرانی ہو گئی ہے، اس کے کجاوے کے تسمے کثرت استعمال سے ٹوٹ پھوٹ کر گر گئے ہیں لیکن چالاکی اتنی ہے، کہ جب چلتی ہے تو ایسی تیز رفتاری دکھاتی ہے، کہ سرخ تیز رو بادلوں کو بھی مات کر دیتی ہے۔

بطلیح اسفار ترکن بقیۃ　　　　منھا فاحنق صلبھا و سنامھا

واذا تغالی لحمھا وتحسرت　　　　وتقطعت بعد الکلال خدامھا

فلھا ھباب فی الزمام کانھا　　　　صھباء خف مع الجنوب جھامھا

اور یہاں سے اپنی اس اونٹنی کا وصف اور امتیازی خصوصیات گنانا شروع کر دیتا ہے چنانچہ اس کی تیز رفتاری کی تشبیہ کبھی اس بادل سے دیتا ہے جسے جنوب کی ہوا اڑائے لئے پھرتی ہے، اور کبھی اس مادہ گورخر اور نیل گائے کی تیزی سے جس کا بچہ کھو گیا ہو، اور وہ دیوانہ وار اس کی تلاش میں بھاگتی پھرتی ہو، اور تشبیہ دیتے وقت ان جانوروں کی نقل و حرکت، ان کے اعضا و انداز، ان کا شکاریوں سے

ڈر کر بھاگنا، شکاری کتوں سے مقابلہ کرنا، اور دو نامی کتوں یعنی سخام اور کساب کو سینگ سے مار ڈالنا، غرضکہ ان سب اوصاف و اطوار کی ایسی تصویر کھینچتا ہے، کہ گمان ہونے لگتا ہے، کہ ان ہی کا وصف پیش نظر ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، یہ جملہ معترضہ کے طور پر آیا ہے، اصل بات تو اسے اپنی اونٹنی کی برق رفتاری بتانی ہے، لبید نے اپنی اونٹنی اور اس کی چال ڈھال کا اتنا تفصیل اور دقت نظری سے نقشہ کھینچا ہے، کہ اس میں طرفہ کو بھی مات کر دیتا ہے،

اونٹنی اور اس سے متعلق خصوصیات کو بیان کرنے کے بعد جس کا سلسلہ دراز ۵۰ ویں شعر تک چلتا ہے، پھر اپنی محبوبہ نوار سے خطاب کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ اگر تجھے اس بات کی غلط فہمی ہے، کہ تم میرے ساتھ جو بھی سلوک کرو، میں تمہارا ہی رہوں گا، تو اس غلط فہمی کو دور کر لو، مجھے محبت اور قطع محبت دونوں فن آتے ہیں، جو مجھ سے محبت کرے گا، میں اس سے محبت کروں گا، جو کٹے گا، میں بھی اس سے کٹ جاؤں گا، یہی نہیں بلکہ جس جگہ محبت نہیں ملتی، اس جگہ کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں، اسے بھی چھوڑ دیتا ہوں،

أولم تکن تدری نوار بأننی　　　　وصال عقد حبائل جذامھا

تراک أمکنۃ اذا لم أرضھا　　　　أو یرتبط بعض النفوس حمامھا

اس کے بعد اپنی لذت کوشیوں، شراب و کباب اور محفل یاران خوش باش کا ذکر کرتا ہے، اور پھر یہ بتاتا ہے کہ وہ اپنے قبیلہ کی حفاظت و حمایت کرتا ہے، اس کام میں اس کا ساتھ اس کا تیز رفتار گھوڑا دیتا ہے، اس کے بعد الربیع بن زیاد اور اس کے درمیان النعمان بن المنذر کے دربار میں جو مناظرہ ہوا تھا اس کا ذکر کر کے فخر کرتا ہے، اور کہتا ہے، کہ میں اتنا شریف اور کارہائے نمایاں کرنے والا انسان ہوں، کہ حریف اپنے بزرگوں کے کارنامے گنا کر بھی مجھ سے جیت نہ سکا،

انکرت باطلھا وبؤت بحقھا　　　　عندی ولم یفخر علی کرامھا

(بقیہ آئندہ)

شیخ غلام نقشبند گھوسوی لکھنوی

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

شاہ عالم بادشاہ کی قدردانی

شیخ غلام نقشبند نے تین سلاطین مغلیہ کا دور پایا ہے، ان کی پیدائش شاہجہان کے دور (سنہ ۱۰۳۶ھ تا سنہ ۱۰۹۸ھ) میں ہوئی، اسی دور میں تحصیل و تکمیل سے فراغت کے بعد لکھنؤ میں شیخ پیر محمد کے سجادہ نشین اور انکے مدرسہ کے مدرس ہوئے، اورنگ زیب عالمگیر کے دور (سنہ ۱۰۹۸ھ تا سنہ ۱۱۱۸ھ) میں ان کے درس و افادہ کا شباب تھا، ان کی وفات سے دو سال پہلے تک شاہ عالم بن عالمگیر کا دور (سنہ ۱۱۱۸ھ تا ۱۱۲۴ھ) تھا، اس کے بعد مغل سلطنت کا زوال شروع ہوا، شاہجہاں اور عالمگیر دونوں خصوصاً عالمگیر علماء وفضلاء کا بڑا قدرداں تھا، مگر ان دونوں سے شیخ غلام نقشبند کے تعلق کا پتہ نہیں چلتا، البتہ شاہ عالم کے بارے میں تصریح ہے کہ اس نے شیخ صاحب کے علمی کمالات کا شہرہ سنکر ملاقات اور بڑی قدردانی کی، مآثر الکرام میں ہے :-

شاہ عالم بہادر شاہ ایشان را تکلیف ملاقات کرد، اعزاز و اکرام بیش از حد بہ تقدیم رسانید[1]	شاہ عالم بہادر شاہ نے ان کو ملاقات کی تکلیف دی اور حد سے زیادہ تعظیم و تکریم کا مظاہرہ کیا،

[1] مآثر الکرام، ذکر عبد الجلیل بلگرامی، ص ۲۱۲،

سبحۃ المرجان میں ہے

وکلفہ شاہ عالم بن السلطان عالمگیر الملاقاۃ واقبل علیہ فی نہایۃ التعظیم والمداراۃ[1]	شاہ عالم بن عالمگیر نے ان کو ملاقات کی تکلیف دی اور ان کے ساتھ نہایت خاطر مدارات سے پیش آیا۔

مگر اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ ملاقات دہلی میں ہوئی یا لکھنؤ میں، نزہتہ الخواطر میں ہے کہ لکھنؤ میں ہوئی،

ان شاہ عالم بن عالمگیر الدھلوی لقیہ بمدینۃ لکھنؤ واکرمہ غایۃ الاکرام[2]	شاہ عالم بن عالمگیر دہلوی نے ان سے شہر لکھنؤ میں ملاقات کر کے نہایت تعظیم و تکریم کی،

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملاقات وقتی اکرام و احترام تک محدود رہی اور شیخ صاحب نے کوئی جاگیر یا منصب قبول نہیں فرمایا،

شرعی امور و معاملات میں شدت

شیخ غلام نقشبند خالص دینی اور علمی ماحول کے پروردہ تھے، ان کے دادا گھوسی کے قاضی اور میر علی عاشقاں سرائمیری کے مرید تھے، انکی ذات شریعت و طریقت کی جامع تھی، ان کے والد علوم نقلیہ و عقلیہ میں کمال کیساتھ تقوی میں نمایاں مقام رکھتے تھے، شیخ عبد القدوس نظام آبادی اور شیخ پیر محمد لکھنوی سے روحانی و احسانی نسبت رکھتے تھے، غرض شیخ صاحب کا گھرانا علم و معرفت کا مجمع البحرین تھا، اور شریعت کے اوامر و نواہی پر شدت سے عمل کرتا تھا، خود شیخ صاحب علوم شرعیہ کے نامور عالم و مدرس ہونے کے ساتھ علوم باطنیہ میں بھی کامل تھے، شریعت

[1] سبحۃ المرجان ص ۸۷، [2] نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۳،

کے معاملات میں مطلق رو رعایت نہیں کرتے تھے، البتہ ان کے علم دین کے جلال میں حسن و تصوف کا جمال بھی تھا، شرعی تقصیر پر سخت نکیر کرتے مگر توبہ کے بعد دلداری و دلجوئی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے، مآثر الکرام میں ہے

مزاج اقدس ہمہ مصروف حفظ شریعت بود، و بر وفق "الحب للہ و البغض للہ" چون از کسے امرے نا ملائم شرع سر می زد، غبار سخت بر دامن خاطر والا می نشست، و اگر آن کس توفیق توبہ می یافت زیادہ تر از سابق مورد الطاف می گردید، [1]

آپ کا ذہن و مزاج ہمہ تن شریعت کی حفاظت میں مصروف رہتا تھا اور "الحب للہ و البغض للہ" کے مطابق اگر کسی آدمی سے کوئی بات خلاف شرع سرزد ہو جاتی تو سخت برہم ہوتے اور اگر وہ آدمی توبہ کی توفیق پا جاتا تو پہلے سے زیادہ ان کی شفقت و محبت کا مستحق ہو جاتا۔

سبحۃ المرجان میں ہے

وکان الشیخ حامیا للشریعۃ الغراء و حارسا للبیضۃ الملۃ البیضاء [2]

شیخ صاحب شریعت غراء اور ملت بیضاء کے محافظ و نگران تھے،

مآثر الکرام اور سبحۃ المرجان میں اس کا ایک واقعہ درج ہے، ایک دن ایک قلندر جو قید شریعت سے آزاد تھا شیخ صاحب کی مجلس میں آیا آپ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ

[1] مآثر الکرام ص ۲۱۴، [2] سبحۃ المرجان ص ۷۸،

این طائفہ را نہ دیدار خدا میسر شود و نہ شفاعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اس طبقہ کو نہ خدا کا دیدار نصیب ہوگا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت میسر ہوگی،

یہ سن کر قلندر نے برجستہ جواب دیا کہ شیخ! ہم قلندروں کو دیدار خداوندی اور شفاعت نبوی میسر ہوگی، البتہ آپ لوگوں کو کچھ نہیں ملے گا، شیخ صاحب نے اسکی وجہ دریافت کی، قلندر نے کہا کہ آپ حضرات نے زندگی بھر گناہ نہیں کیا ہے اس لئے کل قیامت میں بلا مواخذہ بہشت میں داخل ہو جائیں گے، اور ہم قلندر غرق عصیان ہیں، اس لئے ہم کو رب العزت تعالیٰ شانہ کے حضور میں پیش کیا جائے گا، اور ہم مٹھی بھر گنہ گاروں کی شفاعت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدم رنجہ فرمائیں گے، یہ سنتے ہی شیخ صاحب پر رقت طاری ہوگئی اور جلال کی کیفیت جمال سے بدل گئی، [1] مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ شیخ صاحب اس کے قائل ہوگئے، واقعہ یہ ہے کہ رحمت خداوندی اور شفاعت نبوی پر بھروسہ کرکے غضب خداوندی کا کام جائز نہیں ہے،

شعر و شاعری

شیخ غلام نقشبند زندہ دل شاعر و ادیب بھی تھے، وہ لسانی و ادبی علوم کے مشہور عالم اور اشعار عرب و ایام عرب کے ماہر تھے، "الشعر العربی فی الہند" میں ان کو نمایاں مقام حاصل تھا، وہ عربی زبان کے اچھے شاعر تھے، ان کی شاعری میں قدیم رنگ پایا جاتا ہے اور وہ بڑی حد تک عجمی رنگ و اثر سے مبرا ہے، اس سلسلہ میں تیس اشعار کا ایک قصیدہ ان کے استاد میر محمد شفیع کے مناقب و فضائل میں ہے اور عرب کے مشہور جاہلی شاعر امرء القیس کے معلقہ کے ہم وزن و ہم قافیہ ہے، اس قصیدہ

[1] مآثر الکرام ص ۲۱۵، و سبحۃ المرجان ص ۷۹،

سے شیخ صاحب کے شاعرانہ ذوق ومعیار کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے،

خلیلی هل هاتان دارة جلاجل ودارة سلمى فی قفاف عقنقل

علیها سواری المزن سحت مطیرة فسحت مبانیها صحوح المهلهل

أربع الحبیبة صار للوحش موطنا فیا عجبا من صنع دهر محوّ ل

امنزل سلمى هل تفرج غمتی وتکشف عما تلعن ذات التدلل

على ای ارض خیمت ذات هولة تهول بوجه کالضحا متهلل

فمنذ غداة البین قد بت فی ا[بهوی] بصدر رجوی او بقلب مقتل

أعینی مهلا عبرة الوجد والجوى أأنکما ان معتما الیوم مقتلی

وهل ینفع المبکی عیونا ذوارفا اذا وجهت سلمى رکاب التبتل

حبیب اذا ما جود الغنج عینها فما المحی فیه واحد مؤمل؟

لها عارض تبریقه غیر عارض اسیل صقیل حسنه کالسجنجل

علام؟ تمنینی وفیک قلون وحتام؟ تلهینی بوعد مخیل

مواعید عرقوب تقرمط بینها کقرمطة النخلان نخل المنول

له همة علیا تنوف على السما ومجد مجید نیله لم یسهل

بجیل جلیل من شفیع کاسمه ومن جده خیر الورى خیر مرسل

لزهرة زهراء ودوحة حیدر ویهتز خلقا عطر دار التجمل

لنور به الافلاک والارض نورت وتشوید تسوید وشرق مکلل

اذا ما هداة الناس عدت فراسهم وهادیهم بالمقدام من کل امثل

وبینا سبیل الحق یعشون ظلمة اذا انبلجت شمس هداه فتنجلی

معارفه جلت معالیه قد علت اشم جبال بالفخم مفصل

لدیه علوم لا یدام فناءها واسرار لوح فی الاسرار تجتلی

ولم یوثر الدنیا الدنی نعیمها ویتنعم عند الله احسن مفصل

لقد دام بالرحمن حظ شهوده تجنی جنا العرفان غیر معلل

تجلی له فی کل آن تجلیا لدیه تجلی الطور لم ی[illegible]جهل

ومن سره قد ذاق یعلول طاهر لسرائره منه فهو بالنور ممتلی

شفیعی الیوم الحشر حرزی وموئلی ووجهة قلبی غوث کل مومل

لکل عصام واعتصامی بفضله کفانی قواما ذات یوم التجاجل

ماثره لا یهتدین بعدها؟ ومحصی الحصا محصی الرمال وجندل

یطوف حوالیه المکارم والعلی طواف حجیج حول بیت مهجل

تلامذہ شیخ غلام نقشبند کی مختلف الجہات شخصیت تعلیم و تدریس میں ممتاز مقام رکھتی ہے، انکا حلقۂ درس مشہور تھا بہت سے افاضل نے ان کے دامن میں تعلیم و تربیت حاصل کی، ہندوستان کے اکثر علماء کا تعلیمی سلسلہ ان کی ذات پر ختم ہوتا ہے، وہ فقہ، اصول فقہ، عربی ادب اور حکمت و فلسفہ کے زبردست عالم تھے، اور ان کی درسگاہ سے بقول آزاد بلگرامی ایک جہاں اور خلق کثیر نے فیض اٹھایا، ۱۰۸۵ھ سے سنہ ۱۱۲۶ھ تک تقریباً چالیس[1] سال علوم اسلامیہ کا درس دیا، اور ہزاروں طلبہ نے ان سے تعلیم حاصل کی، ان میں سے چند مشہور تلامذہ کے مختصر حالات درج کئے جاتے ہیں،

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۳، ۲۱۴،

ملا نظام الدین لکھنوی — حضرت ملا نظام الدین بن ملا قطب الدین شہید سہالوی لکھنوی

شیخ صاحب کے ارشد تلامذہ میں ہیں جن کی ذات سے شیخ صاحب کا سلسلۂ درس پورے ہندوستان میں جاری ہوا، اس اعتبار سے ملا نظام الدین اپنے استاد کے صحیح جانشین اور وارث ہیں، والد ماجد کی شہادت کے بعد سہالی سے لکھنؤ چلے آئے، ملا قطب الدین شمس آبادی اور حافظ امان اللہ بنارسی وغیرہ سے پڑھ کر شیخ غلام نقشبند سے لکھنؤ میں پڑھا اور ان ہی کی خدمت میں رہ کر سند فراغت حاصل کی، طریقت کی تلقین و تربیت شیخ عبد الرزاق بانسوی اور میر اسمٰعیل بلگرامی سے پائی، فراغت کے بعد فرنگی محل لکھنؤ میں مسند تدریس بچھائی اور پورے ہندوستان کو علمی فیض پہونچایا وہ واقعی بقول آزاد "استاد جہاں اور نحریر زمان" تھے، ماثر الکرام میں ہے،

و تمام عمر بہ تدریس و تصنیف اشتغال ورزید، و اعتبار و اشتہار عظیم یافت، امروز اکثر قطر ہندوستان نسبت تلمذ بہ مولوی دارند و کلاہ گوشۂ تفاخر می شکنند، و کسے کہ سلسلۂ تلمذ بادمی رساند بین الفضلاء علم امتیازی افروزد مردم بسیار دیدہ شد کہ تحصیل جائے دیگر کردند و برائے اعتبار فاتحہ فراغ از مولوی گرفتند، [۱]

شیخ صاحب نے تمام عمر تدریس و تصنیف کا مشغلہ جاری رکھا اور اس میں اعتماد و شہرت پائی، ان دنوں ہندوستان کے اکثر علماء ملا صاحب سے تلمذ کی نسبت رکھتے ہیں، اور اس پر فخر کرتے ہیں جو شخص اپنا سلسلہ ان سے ملاتا ہے علماء و فضلاء میں ممتاز شمار کیا جاتا ہے بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا کہ دوسری جگہ پڑھ کر سند فراغت ملا صاحب سے لی تاکہ معتمد ہو [۱]

[۱] ماثر الکرام ص ۲۲۰، ذکر ملا نظام الدین،

ملا صاحب کی وفات چہار شنبہ ۹ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ کو لکھنؤ میں ہوئی، ان کے تلامذہ پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے، ان کے استاد شیخ غلام نقشبند کے وطن کے اطراف میں بھی ان کے کئی شاگرد تھے، جن میں مولانا محمد احسن چھریا کوٹی اور مولانا غلام فرید محمد آبادی زیادہ مشہور ہیں مولانا محمد احسن بن محمد اکرام بن سلطان احمد عباسی چھریا کوٹ میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کر کے ملا نظام الدین کی خدمت میں لکھنؤ گئے اور ان سے علوم مروجہ پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، بڑے ذہین و طباع عالم تھے، علوم عقلیہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے، فراغت کے بعد دہلی گئے جہاں ان کی علمی شہرت عام ہوئی اور بہت سے امراء ان کے معتقد ہوگئے، اس سے بعض معاصرین کو حسد ہوا اور ان کو زہر دے دیا گیا، [۱]

مولانا غلام فرید محمد آباد میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ جا کر ملا نظام الدین سے کتب درسیہ کی تعلیم حاصل کی اور ان ہی سے طریقت و روحانیت کا فیض پایا، اسکے بعد وطن آکر زہد و قناعت کی زندگی بسر کی، ایک دن کے ناغہ سے روزہ رکھتے تھے، اپنی روزی خود کماتے تھے، نہایت باوقار، اور صالح انسان تھے، زندگی بھر شادی نہیں کی، اپنی والدہ کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھاتے تھے، ان کی زبان میں اتنا اثر تھا کہ جو بات منھ سے نکلتی تھی وہ پوری ہوتی تھی، اودھ کی نوابی کے زمانہ میں نواب فضل علی خاں حاکم غازی پور نے چکلہ اعظم گڈھ کا ایک حصہ فتح کر کے مولانا غلام فرید کو اس کی حکومت پیش کی مگر آپ نے انکار کر دیا، فرید آباد ان کے نام پر مشہور محلہ ہے [۲]، ملا صاحب کے استاد زادے شیخ احمد بن شیخ غلام نقشبند بھی ان کے شاگرد

[۱] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۶، ۱۷۷، [۲] تجلی نور

ملا نظام الدین لکھنوی رح

حضرت ملا نظام الدین بن ملا قطب الدین شہید سہالوی لکھنوی شیخ صاحب کے ارشد تلامذہ میں ہیں جن کی ذات سے شیخ صاحب کا سلسلۂ درس پورے ہندوستان میں جاری ہوا، اس اعتبار سے ملا نظام الدین اپنے استاد کے صحیح جانشین اور وارث ہیں، والد ماجد کی شہادت کے بعد سہالی سے لکھنؤ چلے آئے، ملا قطب الدین شمس آبادی اور حافظ امان اللہ بنارسی وغیرہ سے پڑھ کر شیخ غلام نقشبند سے لکھنؤ میں پڑھا، اور ان ہی کی خدمت میں رہ کر سند فراغت حاصل کی، طریقت کی تلقین و تربیت شیخ عبد الرزاق بانسوی اور میر اسمٰعیل بلگرامی سے پائی، فراغت کے بعد فرنگی محل لکھنؤ میں مسند تدریس بچھائی اور پورے ہندوستان کو علمی فیض پہونچایا وہ واقعی بقول آزاد "استاد جہاں اور نحریر زمان" تھے، ماٰثر الکرام میں ہے،

و تمام عمر بہ تدریس و تصنیف اشتغال ورزید، و اعتبار و اشتہار عظیم یافت، امروز اکثر قطر ہندوستان نسبت تلمذ بمولوی دارند و کلاہ گوشہ تفاخر می شکنند، و کسے کہ سلسلۂ تلمذ بادمی رساند بین الفضلاء علم امتیازی افروزد مردم بسیار دیدہ شد کہ تحصیل جائے دیگر کردند، و برائے اعتبار فاتحہ فراغ از مولوی گرفتند۔[1]

شیخ صاحب نے تمام عمر تدریس و تصنیف کا مشغلہ جاری رکھا اور اس میں اعتماد و شہرت پائی، ان دنوں ہندوستان کے اکثر علماء ملا صاحب سے تلمذ کی نسبت رکھتے ہیں، اور اس پر فخر کرتے ہیں، جو شخص اپنا سلسلہ ان سے ملاتا ہے علماء و فضلاء میں ممتاز شمار کیا جاتا ہے، بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا کہ دوسری جگہ پڑھ کر سند فراغت ملا صاحب سے لی تاکہ معتمد و

[1] ماٰثر الکرام ص ۲۲۰، ذکر ملا نظام الدین،

ملا صاحب کی وفات چہار شنبہ ۹ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ کو لکھنؤ میں ہوئی، انکے تلامذہ پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے، ان کے استاد شیخ غلام نقشبند کے وطن کے اطراف میں بھی ان کے کئی شاگرد تھے، جن میں مولانا محمد احسن چریاکوٹی اور مولانا غلام فرید محمد آبادی زیادہ مشہور ہیں، مولانا محمد احسن بن محمد اکرام بن سلطان احمد عباسی چریاکوٹ میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کرکے ملا نظام الدین کی خدمت میں لکھنؤ گئے اور ان سے علوم مروجہ پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، بڑے ذہین و طباع عالم تھے، علوم عقلیہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے، فراغت کے بعد دہلی گئے، جہاں ان کی علمی شہرت عام ہوئی اور بہت سے امراء ان کے معتقد ہوگئے، اس سے بعض معاصرین کو حسد ہوا اور ان کو زہر دے دیا گیا،[1]

مولانا غلام فرید محمد آباد میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ جاکر ملا نظام الدین سے کتب درسیہ کی تعلیم حاصل کی اور ان ہی سے طریقت و روحانیت کا فیض پایا، اسکے بعد وطن آکر زہد و قناعت کی زندگی بسر کی، ایک دن کے ناغہ سے روزہ رکھتے تھے، اپنی روزی خود کماتے تھے، نہایت باوقار، اور صالح انسان تھے، زندگی بھر شادی نہیں کی، اپنی والدہ کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھاتے تھے، ان کی زبان میں اتنا اثر تھا کہ جو بات منھ سے نکلتی تھی وہ پوری ہوتی تھی، اودھ کی نوابی کے زمانہ میں نواب فضل علی خاں حاکم غازی پور نے چکلہ اعظم گڈھ کا ایک حصہ فتح کرکے مولانا غلام فرید کو اس کی حکومت پیش کی مگر آپ نے انکار کر دیا، فرید آباد ان کے نام پر مشہور محلہ ہے،[2] ملا صاحب کے استاد زادے شیخ احمد بن شیخ غلام نقشبند بھی ان کے شاگرد

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۶، ۱۷۷، [2] تجلی نور

تھے جن کا وطن اصلی گھوسی تھا، ان کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

میر عبدالجلیل بلگرامیؒ میر عبدالجلیل بن سید احمد حسینی بلگرامی بھی شیخ صاحب کے خاص تلامذہ میں بڑے پایہ کے عالم تھے، ابتدائی کتابیں میر طفیل محمد اترولوی بلگرامی کی معیت میں میر سعد اللہ بلگرامی سے پڑھیں، اور قصبات پورب میں متوسطات کی تعلیم حاصل کرکے شیخ غلام نقشبند کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اور یہیں سے فراغت پائی، حدیث، تفسیر، لغت، عربیت، تاریخ اور موسیقی میں مہارت تامہ رکھتے تھے، حافظہ اس قدر قوی تھا کہ عربی لغت کی مشہور اور ضخیم کتاب القاموس زبانی یاد کر لی تھی، استاد شاگرد کی تعریف و توصیف میں بڑی لذت محسوس کرتے تھے، دونوں بزرگوں میں خط و کتابت رہا کرتی تھی،

میر عبدالجلیل ابتدا میں تحصیل علم کے لئے میر طفیل محمد کے ساتھ آگرہ گئے جہاں نواب فضائل خاں سابق میر منشی سے ملاقات ہوئی جو شاہی ملازمت ترک کرکے گوشہ نشین ہو گئے تھے، کچھ دنوں کے بعد شاہ حسین خاں سرکار لکھنؤ کے دیوان مقرر ہوئے، اور اس سلسلہ میں دکن سے آگرہ آئے تو میر عبدالجلیل اور میر طفیل محمد ان کے ہمراہ لکھنؤ چلے آئے، شاہ حسین خاں نے ان دونوں حضرات کے ساتھ بڑی مراعات کیں، اسی زمانہ میں میر عبدالجلیل نے شیخ غلام نقشبند سے شرف تلمذ حاصل کیا، اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ سے فرخ سیر کے دور تک فوج میں وقائع نگاری کے منصب پر فائز رہے، عربی، فارسی، ہندی، ترکی زبانوں کے ماہر تھے اور ان تمام زبانوں میں ان کی تصانیف ہیں، ۲۳ ربیع الآخر ۱۱۳۸ھ میں دہلی میں فوت ہوئے، اور بلگرام میں دفن کئے گئے۔[1]

[1] مآثر الکرام ص ۲۵۸ تا ۲۶۰، و تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۸،

سید فریدالدین بلگرامی سید فریدالدین بلگرامی سید بدنی کے نام سے مشہور تھے، ۱۱۱۳ھ میں میر قادری بلگرامی کے ساتھ ملا جیون امیٹھوی کے حلقۂ درس میں پہونچے اور ان سے تعلیم حاصل کرکے شیخ غلام نقشبند کی درسگاہ میں حاضر ہوئے، سید فریدالدین نے یہیں بقیہ کتب درسیہ پڑھ کر فراغت پائی، ۱۱۲۰ھ میں فوت ہوئے،[1]

سید قادری بلگرامی سید قادری بلگرامی نے ابتدا میں اپنے والد سید ضیاء اللہ بلگرامی سے حفظ قرآن اور تجوید کی تعلیم حاصل کی اور ان سے ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد سید فریدالدین بلگرامی کے ساتھ ملا جیون امیٹھوی سے پڑھا اور بقیہ کتابیں شیخ غلام نقشبند سے پڑھیں، فراغت سے پہلے حرمین شریفین گئے، اور دو بار حج و زیارت کی سعادت سے بہرہ ور ہو کر کربلا اور بغداد کے مشائخ سے قادریہ، رفاعیہ اور شاذلیہ سلاسل میں بیعت ہوئے، شب پنجشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱۴۵ھ میں بلگرام میں فوت ہوئے،[2]

شیخ نورالہدیٰ امیٹھوی شیخ نورالہدیٰ بن مودود بن عبدالواسع عثمانی امیٹھی میں پیدا ہوئے، حفظ قرآن کے بعد شیخ غلام نقشبند اور دیگر علماء سے پڑھ کر پندرہ ۱۵ سال کی عمر میں جملہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہوئے، نہایت ذہین وطباع اور دین و دیانت میں پختہ تھے، علمی بحث و مباحثہ سے دلچسپی رکھتے تھے، پوری زندگی اپنے استاد کی طرح درس و تدریس میں بسر کی، اور ۱۳ رجب ۱۱۳۳ھ میں فوت ہوئے،[3]

مفتی شرف الدین لکھنویؒ مفتی شرف الدین بن محی الدین بن صدر الدین اعظمی لکھنوی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی، اور شیخ غلام نقشبند سے تفسیر بیضاوی کے چند اسباق پڑھ کر ان ہی سے طریقت کی تعلیم حاصل کی، بڑے عالم و فقیہ تھے، شاہی

[1] مآثر الکرام ص ۱۴۳، و نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۲۶۳، [2] مآثر الکرام ص ۱۴۴، ۱۴۵، و سبحۃ المرجان ص ۲۵۳، [3] نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۳۹۷،

خدمات کے صلہ میں عالمگیر نے چار صدی ذات کے منصب سے نوازا جو محمد شاہ کے دور تک قائم رہا، بعد میں اس میں سہ ہزاری ذات کا اضافہ ہوا، فدائی خاں حاکم بہار کے نائب بھی رہے، حاشیہ شرح مواقف اور حاشیہ تفسیر بیضاوی ان کی تصانیف میں مشہور ہیں، ذوالحجہ ۱۱۳۲ھ میں فوت ہوئے[1]،

تصانیف شیخ غلام نقشبند تعلیم و تدریس کے ساتھ صاحب تصنیف و تالیف بھی تھے، متعدد علوم و فنون میں ان کی تصانیف ہیں، تذکرہ نگاروں نے حسب ذیل کتابوں کے نام لکھے ہیں،

(۱) انوار القرآن، اس میں ربع قرآن کی تفسیر مع حاشیہ کے ہے (۲) فرقان الانوار (۳) تفسیر سورۂ اعراف مع حواشی (۴) تفسیر سورۂ مریم، (۵) تفسیر سورۂ طٰہٰ (۶) تفسیر سورۂ محمدؐ (۷) تفسیر سورہ یوسفؑ (۸) تفسیر سورۂ الرحمٰن (۹) تفسیر سورۂ عم مع حواشی (۱۰) تفسیر سورۂ کوثر (۱۱) تفسیر سورۂ اخلاص (۱۲) تفسیر آیت اللہ نور السمٰوات والارض (۱۳) تفسیر آیت انا عرضنا الامانۃ (۱۴) تفسیر آیت افحسبتم (۱۵) تفسیر آیت لا تقولن لشیٔ انی فاعل ذٰلک غداً (۱۶) تفسیر آیت الرحمٰن علی العرش استویٰ (۱۷) تفسیر آیت کلوا واشربوا (۱۸) لامعہ عرشیہ مسئلہ وحدۃ الوجود میں (۱۹) شرح قصیدہ خزرجیہ علم العروض میں، آزاد بلگرامی نے ان کتابوں کے نام لکھکر "وغیرہ ذٰلک" لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے علاوہ شیخ صاحب کی اور تصانیف بھی ہیں[2]،

وفات شیخ غلام نقشبند کے سوانح نگار متفق ہیں کہ ان کی وفات آخری رجب ۱۱۲۶ھ میں لکھنؤ میں ہوئی، اور اپنے استاد و مرشد حضرت شیخ پیر محمد لکھنوی کے مزار کے قریب

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۱۰۵، [2] مآثر الکرام ص ۲۱۶، و سبحۃ المرجان ص ۸۷، تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۵، نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۴،

ٹیلہ پیر محمد شاہ میں دفن کئے گئے، ان کی پیدائش ذوالحجہ ۱۰۵۱ھ میں ہوئی تھی، اس حساب سے وفات کے وقت تقریباً ۷۵ سال کی عمر تھی،

اولاد اولاد امجاد میں صرف ایک صاحبزادے شیخ احمد کا حال معلوم ہے، جو اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کے مدرسہ اور خانقاہ میں ان کے جانشین ہوئے، لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے پہلے اپنے والد شیخ غلام نقشبند سے پڑھا، پھر ملا نظام الدین سے تکمیل کر کے شیخ پیر محمد کے مدرسہ اور خانقاہ میں تدریس و مشیخت کی مسند پر بیٹھے اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری کیا، اپنے والد کی طرح شیخ احمد بھی فقہ، اصول فقہ، عربیت وغیرہ میں ماہر تھے، بہت سے علماء نے ان سے استفادہ کیا، ۱۱۵۹ھ میں فوت ہوئے اور ان کے صاحبزادے شیخ قطب الهدی بن شیخ احمد بن شیخ غلام نقشبند نے تدریس و ارشاد کی جگہ سنبھالی[1]، اس عثمانی خانوادہ کے گھوسی سے لکھنؤ منتقل ہو جانے کے بعد اس دیار میں اسکے کسی فرد کا پتہ نہیں چلتا ہے، اس کے باوجود اس علاقہ کے عام لوگ اپنے کو عثمانی کی نسبت سے مشہور کرتے ہیں، جس کے لئے کوئی علمی اور تاریخی دلیل نہیں ہے،

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۴،

اخوان المسلمین کی تنظیمی و نظریاتی بنیادیں

از جناب ڈاکٹر سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے، پی ایچ ڈی، ریڈر شعبۂ عربی فارسی و اردو
وینکٹیشورا یونیورسٹی، آندھرا پردیش

اخوان المسلمین عالم اسلامی کی سب سے بڑی منظم اسلامی تحریک ہے، جو بیسویں صدی میں وجود میں آئی، ۱۹۲۸ء میں شیخ حسن البنا نے اس تحریک کا آغاز کیا، قدرت نے انھیں غیر معمولی ذہانت اور تنظیمی صلاحیت سے نوازا تھا، وہ ایک جانب جدید علوم سے باخبر تھے، اور دوسری جانب علوم اسلامیہ پر مفکرانہ نظر رکھتے تھے، ان کی اس عظیم فکر کا مظہر اخوان المسلمین کی تحریک ہے۔ دراصل مصر میں سید جمال الدین افغانی، محمد عبدہٗ اور سید رشید رضا کے اثرات نے اس عظیم اسلامی تحریک کو جنم دیا، خود شیخ حسن البنا رسالہ المنار کے کچھ عرصہ کیلیے اڈیٹر رہے، اور سید رشید رضا کے خیالات سے متاثر ہوئے، سید جمال الدین افغانی نے اسلام کی جو سیاسی تعبیر پیش کی تھی اس کا ثمر تحریک اخوان المسلمین ہے، سید جمال الدین افغانی کے شاگرد محمد عبدہٗ نے سیاسی جد و جہد ترک کر کے انگریزوں سے تعاون کی راہ اختیار کی شروع میں سید رشید رضا کا بھی یہی مسلک رہا مگر ترکی میں مصطفےٰ کمال کے سیاسی و تہذیبی انقلاب نے انھیں یقین دلا دیا کہ سیاست سے علٰحدگی صحیح نہیں، چنانچہ انھوں نے سیاسی مسائل سے بھی دلچسپی لینی شروع کر دی، ان کی تربیت و صحبت کے اثر سے شیخ حسن البنا پر پڑے، جنھوں نے اسلام کو ایک انقلابی زندہ تحریک کی حیثیت سے پیش کرنے کا عزم کیا،

اس میں شبہ نہیں کہ اس سے قبل سنوسی تحریک نے عربوں کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا تھا، نیم فوجی اسلامی تحریک تھی جس کا میدان عمل وہ اصل لیبیا تھا[1]، اخوان المسلمین کی تحریک عصر جدید کے تقاضوں سے وجود میں آئی، اس میں اور دوسری اسلامی تحریکوں میں فرق یہ ہے کہ اس کی بنیاد اور تنظیم جدید جمہوری تحریکوں کے انداز پر ہے، اس نے لٹریچر اور صحافت سے جس قدر کام لیا ہے اس کی مثال اگر کہیں ملتی ہے تو ہندوستان ہی کی ایک اسلامی تحریک میں، عصر جدید میں مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ دین کو کھوئے بغیر کس طرح وہ جدید تہذیبی و مادی ترقیوں کو حاصل کریں، اخوان نے اس سلسلہ میں تین باتوں کو پیش نظر رکھا ہے :۔

۱۔ جدید تہذیب کا گہرا اور معروضی مطالعہ کیا جائے، تاکہ اس کے مفید و مضر اثرات کا اندازہ کر کے اسکے لحاظ سے رد و قبول کا فیصلہ کیا جاسکے۔

۲۔ دین کو اسلامی روح کی روشنی میں دیکھا جائے اور اس کے مطابق معاشرے کی تشکیل کی جائے،

۳۔ آزادیٔ فکر اور اجتہاد کی راہ ہموار کی جائے اور دین کی شمع اس طرح جلائی جائے جس سے زندگی کا ہر گوشہ روشن ہو سکے۔

اخوان کی دعوت دین سے شروع ہوئی، مگر دین کا مفہوم ان کے نزدیک بہت وسیع ہے، شیخ حسن البنا کا خود اعتراف ہے کہ ان کی دعوت میں بڑی لچک ہے، دراصل اخوان کے اصول انقلاب انگیز ہیں، شیخ حسن البنا کی تقسیم کے مطابق پہلا مرحلہ اخوان کی دعوت کو عام کرنے کا ہے تاکہ مسلمانوں میں ایک عام فکری بیداری پیدا کر کے معاشرہ کے تمام طبقات کو اس تحریک کی دعوت سے آگاہ کیا جائے، دوسرا مرحلہ تیاری کا ہے جس میں رفقاء کی ذہنی اور

[1] مزید تفصیل کے لیے راقم الحروف کا مقالہ سنوسی تحریک پر ملاحظہ ہو معارف اپریل ۱۹۵۰ء

جسمانی تربیت ضروری ہے، ان کو فوجوں کی طرح منظم کیا جائے گا اور ان کے اندر تنظیم کی قوت پیدا کیجائیگی، تیسرا مرحلہ عمل، نفاذ اور نتائج کا ہے، شیخ حسن البنا کہتے ہیں کہ آخری مقصد اور مکمل کوششیں اس وقت تک بار آور نہیں ہوسکتیں جب تک کہ دعوت عام نہ ہو، رفقاء کی کثرت نہ ہو، اور تنظیم میں استحکام نہ پیدا ہو[1]،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ کا مقصد یہ تھا کہ عوامی سطح پر کام کر کے معاشرہ کو اسلامی اصولوں کو قبول کرنے کے لیے تیار کیا جائے کہ بغیر زمین تیار کیے تخم ریزی فعل عبث ہے، عوام کی تیاری وتائید، رفقاء کی کثرت اور تنظیم میں استحکام بلاشبہ کسی تحریک کو کامیاب بنانے کی ضامن ہے،

شیخ حسن البنا کے ذہن میں دعوت اسلامیہ کے مختلف مراحل تھے، اور وہ اپنی تحریک کو ان مراحل سے وابستہ سمجھتے تھے، ان کا یہ پختہ خیال تھا کہ اعلائے دین کے لیے جد وجہد کرنا اور لوگوں کو وسیع پیمانہ پر اس دعوت میں شریک اور گمراہی سے بچانا بنیادی ذمہ داری ہے، ان کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول خذ ما صفا ودع ما کدر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مشرق ومغرب میں جتنے عمدہ اصول ہیں ان کو اپنانا چاہیے، ایک بار شیخ نے اخوان کے ایک مجمع میں فرمایا کہ اگر اشتراکی تم سے کہیں کہ ہمارے اصول انسانوں میں مساوات، سماجی اور معاشی انصاف کے ضامن ہیں تو اخوان کو ان سے صاف کہنا چاہیے کہ ہمارے اصولوں میں نہ صرف تمہاری یہ تمام خوبیاں ہیں بلکہ تم سے زیادہ مکمل، منظم اور انسانیت کے درد کو دور کرنے والا اسلامی نظام حیات ہے، جن نظریات پر تم فخر کرتے ہو وہ نظریات ہمارے یہاں مزید خوبیوں کے ساتھ موجود ہیں، شیخ نے جب عرب کے بادشاہوں اور امیروں کو دعوتی خطوط لکھے

---

[1] قانون النظام الاساسی للهیئة ص ۱۲۵

اور ان کو اسلامی نظام حکومت کے قیام کی طرف بلایا تو مصر کے حکمرانوں کو بھی اسلامی نظام حیات کی دعوت دی اور شاہ فاروق اور نحاس پاشا کو مخاطب کیا جس کا عنوان تھا "نحو النور" (نور کی طرف)، شیخ اس خط میں لکھتے ہیں کہ "دنیا میں اسلام کے سوا کوئی ایسا نظام نہیں جو امت کو زندگی کی پیچیدگیوں میں ترقی کے منازل طے کرا سکے اور اس کو آگے بڑھا سکے۔

وہ تمام اصول ومبادی جو فرد، جماعت یا حکومت اور قوم سے متعلق ہیں یا ان کے باہمی رشتوں سے تعلق رکھتے ہیں، وہ سب پوری باریکیوں اور مصلحتوں کے ساتھ اسلامی نظام میں جمع ہیں، اور وہ ایک ایسا نظام ہے جو جدید وقدیم سارے نظاموں پر فوقیت اور زندگی کے سارے شعبوں کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے"، شیخ کو یقین کامل تھا کہ اسلام ہی کے سایہ میں دور جدید میں انسانوں کو پرسکون زندگی میسر آسکتی ہے، انکے نزدیک زندگی کے سارے جدید نظام انسانیت کے لیے سم قاتل اور زہر ہلاہل سے کم نہیں، انھوں نے اعلان کیا کہ قومیت پرستی، سرمایہ داری اور اشتراکیت سب مرض ہیں دوا نہیں اس کا علاج نہیں ہیں، شیخ فرماتے ہیں کہ اخوان کوئی نیا پیغام لے کر نہیں آئے، یہ وہی پیغام ہے جو ہر دور میں انبیاء علیہم السلام لیکر آئے، اور آخر میں یہی پیغام انسانیت اور پیغام رحمت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا، اخوان صرف ایک بھولا ہوا سبق یاد دلا رہے ہیں، انکی دعوت کسی ایک گوشہ تک محدود نہیں بلکہ مذہب، معیشت، معاشرت اور سیاست زندگی کے سارے ہی پہلوؤں پر حاوی ہے، اخوان کی دعوت سیاسی، فکری، اجتماعی اور معاشی دعوت ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سنت نبوی پر عمل کرنے کی دعوت ہے[1]۔

اخوان نظریاتی طور پر چند اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہیں، انکے یہاں پہلا اصول علمیت ہے، وہ علوم پر گہری نظر کو ضروری تصور کرتے، قرآن مجید کو وہ علم کا منبع قرار دیتے ہیں،

---

[1] الاخوان المسلمون کبری الحرکات الاسلامیة الحدیثة تالیف ڈاکٹر اسحٰق موسیٰ الحسینی مطبوعہ دار بیروت طبع ثانی ص ۸۱ - ۸۹

اور اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ عصر جدید کے پیدا کردہ شبہات کا ازالہ ہو جائے، اور قرآن مجید
زمانے کے تقاضوں کے مطابق معلوم ہو، وہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ علم کچھ اور ہے اور دین کچھ اور،
وہ علم اور دین میں تضاد کے قائل نہیں،

دوسرا اصول عملیت ہے۔ ان کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایک قرآنی امت
بنا دیں اور اس کی بنیاد پر تمام اسلامی فرقوں کو نظریاتی طور سے قریب لے آئیں، اس طرح
ایک ایسی اسلامی معاشرہ کی تعمیر کریں جس میں اختلافات کم سے کم تر ہوں اور جس کی بنیاد
صرف اسلام ہو، وہ صاف اعلان کرتے ہیں کہ ہم اس وقت تک آرام حرام سمجھتے ہیں،
جب تک کہ قرآن مجید بحیثیت دستور زندگی کے رائج نہ ہو جائے، ہم اسی مقصد کی راہ میں
زندگی اور اسی کے حصول کے لیے موت کے متمنی ہیں،

تیسرا اصول معاشی ہے، وہ ایک ایسے معاشرہ کو وجود میں لانا چاہتے ہیں جس میں سماجی
عدل (Social justice) پایا جائے، اور جہاں افراد و طبقات میں توازن ہو،
اور ہر شہری کی معاشی زندگی کی کفالت کی ذمہ دار حکومت ہو، جو ہر فرد بشر کے لیے معاشی زندگی
کے مواقع فراہم کرتی ہو اور ایسا معاشی متوازن نظام ہو جو سماجی انصاف کے ساتھ معاشی
طور پر آگے بڑھنے کی امنگ بھی رکھتا ہو،

اخوان کا چوتھا اصول معاشرتی بھلائی (Social Welfare) کا ہے،
لوگوں سے جہالت دور کرنا، ان کے اندر بلندی پیدا کرنا اور انھیں فقر و ذلت سے محفوظ رکھنا،
ایسے کام ہیں جنھیں اخوان اپنے فرائض میں شمار کرتے ہیں، اس لیے کہ ایک ترقی یافتہ سماج
ان بنیادی عیوب اور کمزوریوں کو دور کیے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔

ان کا پانچواں اصول یہ ہے کہ تمام عالم اسلامی کو استعماری طاقتوں سے نجات دلائی جائے،

اور دنیا میں جہاں بھی مسلم اقلیتیں ہیں ان کی مدد کی جائے اور اسلام کے پھیلانے پر دنیا میں آزادی اور
حقوق انسانی کے تحفظ کی کوشش کی جائے۔

وہ ایک ایسا نظام حکومت عمل میں لانا چاہتے ہیں جو صالح ہو اور جو اسلام کی تعلیمات
کو عمل میں پیش کرے تاکہ وہ دنیا کے سامنے ایک نمونہ بن سکے، اور اس نظام میں انسانی
حقوق کا تحفظ ممکن ہو سکے گا،

اخوان کا چھٹا اصول انسانی تہذیب کی از سر نو تنظیم ہے جس میں مادیت اور روحانیت
کا حسین امتزاج ہو، اور ایک ایسی فضا پیدا ہو سکے جس میں انسانیت اطمینان کا سانس
لے سکے۔ اخوانیوں کا نظریہ ہے کہ اسلامی اصول اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ اس پر عمل کرنے
سے ایک ایسا تمدن وجود میں آسکتا ہے جو اعلیٰ انسانی و اخلاقی صفات کا حامل ہو، اس طرح
ان کے خیال میں دور جدید میں روحانیت کی پیاسی دنیا کو سکون کی دولت مل سکے گی،

اخوان کے نظریات میں سے یہ نظریہ بڑا اہم ہے کہ فقہی اختلافات نظر انداز کر کے فروعات دین
میں ان کا خیال زیادہ نہ کیا جائے، اس لیے کہ اصل مقصد دین پر عمل ہے،

اخوان امراء سے الگ رہنے پر بھی زور دیتے ہیں، وہ ان تمام گروہوں سے بھی کنارہ کش
رہنا چاہتے ہیں جو سیاسی، ذاتی مفاد اور غیر دینی مقاصد کی خاطر صرف حصول منفعت کے لیے
وجود میں آئے ہیں،

وہ اسلامی حکومت کے قیام پر زور دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اسلام کے دائرہ میں
حکومت شامل ہے، قوانین، تعلیم، معیشت، معاشرت اور سارے شعبہ ہائے زندگی پر حکومت
کی دست درازیاں جاری ہیں، اس سلسلہ میں ان کا یہ خیال قابل غور ہے کہ وہ حکومت
ذاتی منفعتوں کے لیے قائم نہیں کرنا چاہتے بلکہ امت اسلامیہ میں جہاں بھی ایسے لوگ مل جائیں جو

اس عظیم بوجھ کو اٹھانے کے لیے تیار ہوں، تو وہ ان کے مددگاروں میں شامل ہونے کو تیار ہیں، وہ ان کی فوج میں داخل ہو سکتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہم پہلے حکومت قائم نہیں کرنا چاہتے بلکہ پہلے ہم اپنے اصولوں اور نظریات کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں،

اگرچہ ان نظریات میں جدیدیت ہے، مگر یہ خالص اسلامی تعلیمات کے دائرہ کے اندر ہیں، اخوان کے تصور کے مطابق مذہب، حکومت اور زندگی کے تمام پہلوؤں کو قرآن و حدیث کے احکام کے مطابق ہونا ضروری ہے، شیخ حسن البنا کی تعلیمات کا منبع قرآن و حدیث ہی کو قرار دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اسلام کو ہمیں اس طرح پیش کرنا چاہیے کہ وہ انسانیت کے درد کا درماں ثابت ہو سکے، ہم کو اپنے زمانہ پر کوئی ایسی چیز مسلط نہ کرنی چاہیے جو زمانہ کا ساتھ نہ دے، وہ اسلامی روح کے ساتھ ساتھ اسلام کو ان قیود سے پابند نہیں کرنا چاہتے جو مختلف ادوار میں اس پر عائد کر دی گئی ہیں، وہ زمانہ کی رسومات سے آزاد ہو کر تمام بنی نوع انسان کے لیے اسلام کا پیغام پیش کرتے ہیں، شیخ حسن البنا کے نزدیک، اخوان المسلمین اس اسلام کی دعوت ہے جس میں سماجی اثرات اور زمانے کا عکس ساتھ ساتھ ہو، وہ اسی کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جو صحابۂ کرام کے دور میں تھا جبکہ اسلام زندگی کے سارے پہلوؤں پر حاوی تھا جن میں عقیدہ، عبادت، وطن، روحانیت اور حکومت وغیرہ سب کچھ شامل تھا، اور اسی بنیاد پر سیاست سے اسلام کو جدا نہیں کیا جا سکتا،[۱]

اخوان سے اکثر لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ وہ سیاست میں حصہ لیتے ہیں، اگر وہ دیندار ہیں تو ان کو سیاست میں دخل دینا مناسب نہیں، اخوان اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اگر اسلام میں سیاست، معیشت، قانون، علم اجتماع اور ثقافت نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ کیا اسلام صرف چند رکعتیں نماز ادا کرنے کا نام ہے، وہ کہتے ہیں کہ اشتراکیت کے داعی کتنے منظم و محکم انداز

[۱] اخوان المسلمین ص ۱۱۳

سے اپنی دعوت پیش کرتے ہیں اور اس کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے ہیں، وہ نظام زندگی کی تبدیلی کی دعوت دیتے ہیں، تو کیا اسلام اس لائق نہیں کہ اس کے طرز زندگی کی جانب لوگوں کو بلایا جائے اور اسلامی نظام زندگی قائم کیا جائے، اخوان کا خیال ہے کہ اگر ہم اسلام کو ایک شریعت سمجھتے ہیں تو ہم کو اس کے نفاذ کی کوشش کرنی چاہیے، اگر وہ دستور حیات ہے تو اس کے بغیر زندہ رہنا عبث ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہماری سیاست یہ ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات کو رائج کریں،[۱]

اخوانیوں کے بنیادی نظریات میں اسلامی حکومت کا قیام نہایت اہم ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اگر سب کچھ حاصل ہو جائے لیکن اسلامی حکومت قائم نہ ہو تو اسلام پر عمل ناقص رہ جائیگا، شیخ فرماتے ہیں کہ قیام حکومت مسلمانوں کے فرائض میں سے ایک اہم فرض ہے، جس طرح لوگوں کو ہدایت دینا اور خود ہدایت حاصل کرنا فرض ہے، اسی طرح اسلامی نظام حکومت کا قیام بھی فرض ہے، حکومت وہ نہیں ہے جو فقہ کی کتابوں میں محدود ہے، بلکہ اسلام کی حکومت کا مطلب تمام شعبہ ہائے زندگی میں احکام شریعت کا نفاذ، اسلامی احکام کی پابندی اور اسلامی سماج کی تعمیر ہے، اس میں اقتصادیات، تعلیمات، قوانین اور معاشرت کی اصلاحات شامل ہیں، اگر ایک فقیہ شرعی احکام کے اصول و فروع پر نظر رکھتا ہے لیکن وہ ایسے اہل حکومت سے تعرض نہیں کرتا جو خلاف اسلام قوانین وضع کرتے ہیں تو ایسے مصلح کی آواز اس شخص کی طرح ہوگی جو بیکار چیخ رہا ہو،

اخوان کا خیال ہے کہ شریعت میں تاویل و تفسیر کی بڑی گنجائش ہے، اسی بنا پر وہ اجتہاد کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی قوانین از سر نو اس انداز سے مرتب کیے جائیں کہ ان میں نئے زمانہ کے نئے مسائل کا حل موجود ہو، اور وہ زمانہ کا ساتھ دے سکیں، تمدنی معاملات میں اخوان کے خیال کے مطابق کسی بھی صالح نظام سے استفادہ کیا جا سکتا ہے،

تحریک اخوان المسلمین نے عملی طور پر مصر کی اسلامی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا،

[۱] اخوان المسلمین ص ۱۱۴

انھوں نے ایک بڑا طبقہ ایسا پیدا کر دیا تھا جو اس زمانہ میں رہ کر اپنی پوری زندگی کو اسلام کی راہ پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے مطابق گذارنے لگا تھا، انھوں نے نوجوانوں اور دانشوروں میں محنت سے کام کیا، نوخیز مسلم نسل کو مغربیت سے بچانے کی بھی کامیاب کوشش کی، بڑی تعداد میں اسلامی لٹریچر فراہم کیا، رسائل اور کتابوں سے مصر کے بازار بھر دیے، اخوانیوں کی صحافت پورے ملک پر چھا گئی تھی، ان کی کتابوں اور رسائل کو پڑھ کر لوگ ایمان کی حرارت محسوس کرنے لگے تھے، اس طرح اخوان کے حوصلے نہایت بلند ہوئے، وہ مسلمانوں کو روحانی بلندی کے ساتھ ساتھ مادی بلندی کی اعلیٰ سطح تک لیجانا چاہتے تھے۔

اخوان المسلمین کے تنظیمی پہلو | اخوان المسلمین نے عالم اسلامی میں پہلی بار ایک ایسی تنظیم اختیار کی جو اس سے قبل کسی اسلامی تحریک کو نصیب نہ ہو سکی تھی، ان کی جماعت میں تعاون و اشتراک کا غیر معمولی مظاہرہ کیا گیا، شیخ حسن البنا تحریک کی تنظیم کے ہر ہر جزو پر گہری نظر رکھتے تھے اور تحریک کے مختلف شعبوں کو پوری طرح سے دیکھتے تھے، وہ اپنی تحریک میں کسی شخص کو اسوقت تک شامل نہیں کرتے تھے جب تک اس کے بارے میں کافی جانچ پڑتال نہ کر لیتے تھے، اخوان نے دور جدید کی نئی تحریکوں اور تنظیموں سے پورا فائدہ اٹھایا، ان کے یہاں اشتراکیت اور فاشسٹ نظاموں کے عملی طور پر طرز جدید کے مفید اصول اپنائے گئے، مگر ان کے فاسد اور انسانیت سوز اصولوں اور برائیوں سے پرہیز کیا گیا۔

ان کے ارکان کی حسب ذیل قسمیں ہیں:۔

(۱) عضو عامل (رکن) (۲) عضو مؤید (ہمدرد)، جب تک کوئی شخص عضو عامل میں شامل نہ ہو جائے، اخوان کے خاص جلسوں میں شرکت کا مجاز نہ سمجھا جاتا تھا، عاملین کی جماعت چار خانوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی، ان چاروں طرز کے عاملین پر ایک نگراں مقرر کیا جاتا تھا، اس طرز کی بہت سی شاخوں کو ایک "مجلس عمومی" کے تحت کر دیا جاتا، یہ مجلس عمومی وہ طریقے سے اصل مرکز یعنی "مرکز عام" سے متعلق ہو جاتی تھی، مجلس عمومی کی کاروائی کی رپورٹ مرکز عام کو بھیجی جاتی تھی، جو تجاویز مجلس عام منظور کرتی تھی اس کی توثیق مرکز عام سے کرانی پڑتی تھی۔

مرکز عام (یا مکتب عام) کا کام یہ تھا کہ وہ اخوان کی عام دلچسپیوں کا جائزہ لیتا تھا، اور وہ بہت سے ایسے ادارے قائم کرتا تھا جو اخوان کی خدمت کر سکیں، اس مرکز عام میں مختلف طرز کے اجتماعات بھی ہوا کرتے تھے۔ (۱) مکتب ارشاد عام: یہ وہ ادارہ تھا جس میں اخوان کے سیاسی نظام کی ذمہ داریوں کو بانٹا جاتا تھا، (۲) الجوالہ: یہ اخوان کی فوجی تنظیم کا نام تھا، اس کے تحت ممبروں کو فوجی تربیت دیجاتی تھی، اس میں وہی لوگ شریک ہوتے تھے جو اس خدمت کے لائق تھے، خصوصاً نوجوان طبقہ، (۳) "النظام الخاص": یہ اخوان کی خفیہ تنظیم تھی، اس میں وہی لوگ شریک کیے جاتے تھے جن پر پورا اعتماد ہوتا تھا، ایسے ممبروں کو صحیح تلاوت کے بعد روحانیت کی تعلیم دی جاتی تھی، پھر ہتھیار استعمال کرنے کا طریقہ سکھایا جاتا تھا، اور قوانین پڑھائے جاتے تھے، آخر میں ایک اندھیرے کمرہ میں لے جا کر ایک "مرشد" ان سے اطاعت کی بیعت لیتا تھا کہ وہ اسلام کی راہ میں جد و جہد کریں گے، اس موقع پر ان سے یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ان سے جو راز کی باتیں بتائی جائیں ان کا اظہار سزائے موت ہے، اس قسم کے ہر رکن کو ایک رقم خفیہ طور پر تحریک کی ترقی کے لیے دینی پڑتی تھی،

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ اخوان کے بارے میں اپنی کتاب "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" میں لکھتے ہیں: "مصر میں اخوان المسلمین کی تحریک اگر اپنی صحیح اور طبعی

وفتار سے آگے بڑھتی رہتی اور اس کے جھنڈے کے نیچے عالم اسلام کے ممتاز مفکرین، ممتاز اہل علم اور ماہرین فن جمع ہو جاتے تو اس تحریک سے بڑی امید تھی کہ وہ اس کام کی تکمیل کر سکے گی جس کا بیڑا سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ نے اٹھایا تھا، یعنی مشرق کے فکر اسلامی کو مغرب کی سطحی اور اندھی تقلید اور جمود دونوں سے آزاد کرنا، مشرق کے فکری خلا کو پر کرنا اور ایک طاقت ور فکر اور سیاسی طور پر آزاد اسلامی معاشرہ کی تشکیل۔"[1]

مشہور مستشرق پروفیسر کینٹ ول اسمتھ اخوان کے بارے میں بڑی مفکرانہ رائے پیش کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ "ہمارے نزدیک عرب سوسائٹی کسی حالت میں ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ کسی متفقہ اخلاقی قوت اور ابھارنے والی طاقت اور کسی اندرونی موثر تحریک کے ذریعہ ٹھوس مواقع نہ پہنچاتی رہے، بہتر سے بہتر معاشرتی یا قومی پروگرام محض کاغذی زینت بن کر رہ جاتے ہیں، اسی لیے عرب سوسائٹی کی روحانی پسپائی جاری رہے گی، اخوان کی اپیل میں معاشرہ کے اکثر مسائل کا برمحل جواب پوشیدہ ہے۔ جب تک کوئی دوسرا گروہ ان مسائل سے نمٹنے کی نسبۃً زیادہ طاقتور خواہش اور جذبہ کے ساتھ نہ سامنے آئے، یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ اخوان کی تحریک باوجود ظلم و استبداد کے زندہ رہے گی، اب تک کمیونسٹوں کو چھوڑ کر اخوان وہ واحد جماعت ہیں جس نے ایک ایسا نصب العین پیش کیا ہے جو زبانی عقیدت مندی سے آگے بڑھ کر بڑے پیمانہ پر تعاون حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔"[2]

تحریک اخوان المسلمین پر اکثر رجعت پسندی کا الزام لگایا جاتا ہے، اس الزام کی تردید پروفیسر اسمتھ نے بڑے عمدہ انداز سے کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "اخوان المسلمین کو شروع سے

---

[1] اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش طبع اول ۱۹۶۳ء، ندوۃ العلماء لکھنؤ، ص ۱۱۱ - ۱۱۲

[2] Islam in modern history. P. 161, 162.

آخر تک رجعت پسند سمجھ لینا ہمارے نزدیک غلط ہوگا، کیونکہ اس میں عدل اور انسان دوستی کی بنیادوں پر ایک جدید سوسائٹی قائم کرنے کی قابل تعریف تعمیری کوشش بھی شامل ہے جو قدیم روایات کی بہترین اقدار سے ماخوذ ہے، وہ جزوی طور پر ایک ایسی قوت فیصلہ کی حامل ہے جو اس زوال دیستی کا خاتمہ کر سکتی ہے جہاں عرب سوسائٹی پہنچ چکی ہے،....... وہ اسلام کو خالص بے حس اور مردہ عقیدت مندوں اور پرستاروں کی جذباتی گرم جوشی یا پیشہ ور روایت پرستوں کے فرسودہ دائرۂ عمل سے جو اپنے خیال و عمل میں عہد ماضی سے وابستہ ہیں، ایک ایسی ابھرتی ہوئی قوت میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے جو جدید مسائل کا مقابلہ کر سکے۔"[1]

جو تحریک مذہب کے نام پر اٹھے اس کو خواہ مخواہ رجعت پسند شمار کرنا صحیح نہیں، اگر اس کے اصول و نظریات انسانیت کے لیے افادی قدریں پیش کرتے ہیں تو ان سے اس کی عظمت کا اندازہ لگانا چاہیے، حق یہ ہے کہ اخوان کی تحریک میں وہ تمام بنیادی قدریں موجود تھیں جو ایک ترقی یافتہ جماعت کو درکار ہوتی ہیں، نظری اور عملی طور پر اخوان کے تصورات بلند تھے، ان کی دعوت کا خاص مرکز عوام الناس تھے، شیخ حسن البنا نے ایک بار خود کہا تھا کہ اخوان کے اکثر لوگ مزدور پیشہ اور غریب طبقہ ہیں جو ہمیشہ ایمان میں پختہ رہے ہیں، غریبی کے خاتمہ کے لیے بھی اخوان نے عملی اقدام کیے، اور انھوں نے تجارت و زراعت سے بھی گہری دلچسپی لی، محض اس بنا پر کہ وہ اسلام کے مطابق حکومت قائم کرنا چاہتے تھے، انھیں رجعت پسند کہنا صحیح نہیں، اگر کسی نئے نظام کی دعوت دینا رجعت پسندی ہے تو اشتراکیت کا شمار رجعت پسندوں میں بدرجہ اولیٰ ہوگا،[2]

اخوان اسلام کی نئی تعبیر پیش کرتے ہیں، وہ اسلامی اصولوں کو مد نظر رکھ کر ایک

---

[1] IBID (بحوالہ اسلامیت و مغربیت کی کشمکش)

[2] الاخوان المسلمین ص ۱۶۹ - ۱۷۷

ماڈرن اور ترقی یافتہ عظمت سے مزین سوسائٹی قائم کرنا چاہتے تھے، وہ قدیم سماجی ورسمی قدروں کے قائل نہیں، اس لیے وہ نہ قدامت پرست ہیں اور نہ قدیم قدروں کو واپس لانا چاہتے ہیں، وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کے ذریعہ ترقی یافتہ معاشرہ قائم کرنے کے علمبردار ہیں، اس لیے وہ رجعت پسند نہیں۔

اخوان نے مساجد، مدارس اور رفاہ عام کے مراکز کا ایک جال پورے مصر پر بچھا دیا تھا، انھوں نے مسلمانوں کی جس طرح خدمت کی علمی اور عملی دونوں لحاظ سے، اس سے علمائے ازہر تک قاصر رہے، قاہرہ ایک ایسا جدید مغربی انداز کا شہر بن گیا تھا کہ لوگ پبلک جگہوں پر نماز ادا کرنے میں شرم محسوس کرتے تھے، شیخ حسن البنا نے اخوان کی تحریک کے ذریعہ سوسائٹی کا رخ بدل دیا، انھوں نے ہزاروں جدید مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا، اور بے شمار نوجوان ان کی تحریک میں داخل ہو گئے، اخوان ایک ایسی منظم تحریک تھی کہ جس پر اس کے امیر کو اختیار کلی حاصل تھا کسی مطلق العنان حکمراں کو بھی ایسی اطاعت نصیب نہ ہوئی ہوگی، جیسی کہ اخوان نے اپنے امیر کے واسطے پیش کی، اخوان کا بہت تھوڑے عرصہ میں مصر پر چھا جانا دراصل ان کی اپنے امیر کی اطاعت کاملہ کا نتیجہ تھا،

۱۹۳۴ء میں اخوان کی طرف حکومت کی توجہ ہوئی اور شیخ حسن البنا نے شاہ مصر اور مصر کے اعلیٰ وزیروں کے نام خطوط لکھے، جن میں انھوں نے مغربی تہذیب پر سخت تنقید کر کے ان کو اسلامی طرز زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی، شیخ حسن البنا نے جوئے کی گرم بازاری، شراب نوشی اور سرکاری دعوتوں میں رقص کا اذن عام، نائٹ کلب، سینما، اخباروں میں عورتوں کی تصویریں اور عورتوں ومردوں کے اختلاط پر سخت انداز میں تنقیدیں کیں، اخوان نے سماجی برائیوں کی روک تھام کے لیے موثر کوششیں کیں جن کے اثرات اس دور میں مرتب ہوئے،

شیخ حسن البنا نے حکومت کی توجہ اس جانب بھی مبذول کرائی کہ مسلمان بچوں کو مشنری اسکولوں یا مغربی استادوں کے ذریعہ سے تعلیم دلوانا نہایت مضر ہے، شیخ نے یہ تجویز پیش کی کہ نئے طرز کے اسلامی مدارس کھولے جائیں، وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کی جسمانی نشو ونما پر بھی خاص طور سے زور دیتے تھے،

دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ تک اخوان نے اس زور وشور سے کام کیا کہ گویا ایک حکومت کے اندر ایک دوسری حکومت قائم ہو گئی تھی، ہر ہر شہر اور قریہ میں اخوان کے مراکز کھل گئے اخوان نے اپنے تعلیمی ادارے کھول دیے، اس طرح انھوں نے سماجی اداروں، مسجدوں، مدرسوں اور تجارتی فرموں کے ذریعہ پورے ملک پر قبضہ کر لیا، اخوانیوں کے اخبارات، پمفلٹ، اور راہنماؤں کے اثرات ہمسایہ ملکوں پر بھی پڑنے لگے، پورے عرب شام، لبنان، اردن، فلسطین، ٹیونس، مراکش اور سوڈان میں اخوان کی شاخیں قائم ہو گئیں،

سید جمال الدین افغانی کی طرح اخوان نے سمجھ لیا تھا کہ اسلامی نظام کا ارتقاء مغربی حکومتوں کے اندر رہ کر ممکن نہیں، لہٰذا انھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا، انھوں نے انگریزوں کو سوئز سے نکالنے کی مہم بھی چلائی[۱]، یہ حقیقت ہے کہ اخوان بہت طاقتور ہو گئے تھے حتی کہ ۱۹۴۸ء میں عرب اسرائیل کی جنگ میں اخوانیوں نے فوج کے ساتھ باقاعدہ جنگ کی اور بڑی بہادری سے جہاد کیا، بقول ڈاکٹر سعید رمضان اسرائیلی فوج سے زیادہ اخوان سے خائف تھے،

۱۹۴۸ء میں حکومت نے اخوان کو غیر قانونی تحریک قرار دیدیا، اور ہزاروں اخوان گرفتار کر لیے گئے، ۱۹۴۹ء میں شیخ حسن البنا کو شہید کر دیا گیا، شیخ کے بعد بھی

۱؎ ملاحظہ ہو ہفت روزہ ریڈینس (Radiance) دہلی، ۲۲ دسمبر ۱۹۷۳ء، امریکہ کی فاضلہ مریم جمیلہ کا مقالہ "شیخ حسن البنا" ص ۷ تا ۱۲

تحریک پورے زور شور سے جاری رہی، حتیٰ کہ ۱۹۵۴ء میں جمال عبدالناصر نے اخوان کو بڑی بے دردی اور وحشت ناک سزاؤں کے ذریعہ ختم کر دیا، اس طرح عالم اسلام کا یہ المیہ خود اسی کے ہاتھوں پیش آیا جس کے دورِ حکومت میں غازہ، صحرائے سینا اور بیت المقدس پر یہودیوں کا قبضہ ہو گیا، اگر مصر میں جمہوریت و آزادی کی فضا قائم ہو جائے تو شاید وہ چنگاریاں جو راکھ کے ڈھیر میں دبی ہیں، دوبارہ گلشن مصر کو بہاراں کر سکیں، اور دلوں کو اسلام کی عظمت سے روشنی و حرارت عطا کر سکیں۔

یہاں ایک سوال قابل غور ضرور ہے کہ یہ طاقت ور تحریک کیوں ناکام رہی؟ اور اس کو کچلنے والے کیوں کامیاب ہو گئے؟ اس کا جواب مختصراً یہی دیا جا سکتا ہے کہ عرب نیشنلزم اور سوشلزم کے فوجی حکمرانوں کے برسر اقتدار آجانے سے تحریک کو نقصان پہنچا، مصر میں جمال عبدالناصر کے دور میں جمہوریت کے فقدان اور ڈکٹیٹرشپ نے عوام کے جذبات و خیالات کو کچل ڈالا، علاوہ ان خارجی اسباب کے اخوان کی خود عجلت پسندی نے بھی ان کو نقصان پہنچایا، شیخ حسن البنا کا خیال تھا کہ ہمارا پہلا کام قریہ قریہ اور شہر شہر دعوت کو عام کرنا ہے، جب تک عوامی سطح پر ذہنی تربیت نہ ہو جائے اس وقت تک سیاست میں دخل اکثر ناکامی کا باعث بنتا ہے، اخوان نے اپنی عجلت پسندی سے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا جس سے انکو سخت آزمائش میں مبتلا ہونا پڑا۔

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

اردو ادب کا سیدین نمبر:- مرتبہ- جناب آل احمد سرور صاحب

لمبی تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۴۸، قیمت۔ ۶ روپے۔ پتہ۔ دفتر مرکزی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔

خواجہ غلام السیدین مرحوم مشہور ماہر تعلیم اور اردو وانگریزی کے لائق و فاضل اہل قلم تھے، انجمن ترقی اردو ہند کے سہ ماہی رسالہ "اردو ادب" نے ان کی یادگار میں یہ خاص نمبر شائع کیا ہے، اس میں ان کے سوانح، فضل و کمال اور تصنیفی خدمات کے متعلق بلند پایہ مضامین شائع کئے گئے ہیں، اور ان کی سیرت و شخصیت، قومی، ملی اور تعلیمی نظریات اور دوسرے افکار و تصورات کا جائزہ لیا گیا ہے، جناب شمسی طہرانی کے مبسوط مقالہ "خواجہ غلام السیدین۔ حالات، زندگی و افکار کے آئینے میں" ان کے خاندانی حالات، تعلیم، ملازمت، علمی، ادبی اور تصنیفی کمالات، قومی، سیاسی اور تعلیمی خیالات، طرز تحریر، اخلاقی عظمت، مروت رواداری، امن پسندی اور انسانیت دوستی وغیرہ کا بڑا اچھا خاکہ ان کی اور دوسرے ارباب قلم کی تحریروں کی مدد سے پیش کیا گیا ہے، ڈاکٹر غلام رسول عبداللہ نے ان کے "فلسفہ انسانیت" کا تجزیہ کیا ہے، پروفیسر قیصر حسین زیدی نے ان کو "مثالی معلم" قرار دیا ہے، ڈاکٹر عبدالغفار

شکیل نے ان کی زبان کی اہمیت دکھائی ہے، اور قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے ان کے ادبی ذوق اور اسلوب نگارش پر روشنی ڈالی ہے، دوسرے مضامین میں ان کی زندگی کے خط و خال عظمت و شرافت اور گوناگوں کمالات کی مصوری کی گئی ہے، اس سلسلہ میں پروفیسر سید بشیر الدین، صالحہ عابد حسین اور ڈاکٹر باقر مہدی کے مضامین دلچسپ اور موثر ہیں، لائق مرتب نے اپنے افتتاحیہ میں خواجہ صاحب کے حالات و کمالات کا مختصر و دلکش مرقع پیش کیا ہے، ایک مضمون میں ان کے خود نوشت حالات بھی درج ہیں، آخر میں ان کے اکیس (۲۱) خطوط اور بعض کتابوں کے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں، یہ نمبر خواجہ صاحب کے فضل و کمال اور ان کی شرافت و کردار کا عمدہ خاکہ ہے۔ اس لئے اس کا مطالعہ مفید اور سبق آموز ہوگا۔

علی گڑھ میگزین کا انتخاب نمبر۔ مرتبہ جناب خلیل احمد بیگ صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ اچھا عمدہ ٹائپ صفحات ۸۰۰ قیمت تحریر نہیں۔ پتہ:۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ کا ادبی مجلہ "علی گڑھ میگزین" پہلے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج اور علی گڈھ منتھلی کے ناموں سے شائع ہوتا تھا، یہ گذشتہ پون صدی سے علم و ادب کی مفید خدمت انجام دے رہا ہے، علی گڑھ سے وابستہ اور بعض غیر وابستہ مشاہیر علم و فن کی نگارشات پر مشتمل ہوتا ہے، سنہ ۵۰ء میں یونیورسٹی کی طلائی جوبلی کے موقع پر میگزین کے خاص نمبر کی اشاعت کا فیصلہ کیا گیا تھا، جوبلی کا پروگرام تو ملتوی ہوگیا مگر خاص نمبر اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، اس میں محمڈن اینگلو کالج اور علی گڈھ منتھلی کے بیالیس (۴۲) منتخب مضامین شامل ہیں ضخامت کی وجہ سے علی گڑھ میگزین کے مضامین کا انتخاب نہیں دیا جاسکا، پہلے محمڈن اینگلو کالج میگزین کے سولہ (۱۶) مضامین درج ہیں، اس میں سر سید احمد خان، مولانا حالی، مولانا شبلی، مولوی ذکاء اللہ، سید محمود، وحید الدین سلیم، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، میر ولایت حسین،

اور سجاد حیدر یلدرم وغیرہ نامور فضلا کے مضامین شامل ہیں، دوسرا حصہ علی گڑھ منتھلی کے منتخب مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مولانا ظفر علی خان، شیخ عبد القادر، مولانا ابو الکلام، عزیز مرزا، اکبر الہ آبادی، مولوی عبد الحق، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی، مولانا اسلم جیراجپوری، مولانا سید سلیمان ندوی، حامد حسن قادری، عبد الستار صدیقی، اقبال سہیل، ثاقب لکھنوی، اور رشید احمد صدیقی وغیرہ جیسے اکابر علم و ادب کے مضامین اور نظموں پر مشتمل ہے، جن اکابر کے مضامین اس نمبر میں ہیں ان میں سے اکثر کے آخر میں مختصر حالات بھی قلمبند کردے گئے ہیں، شروع میں ایک مبسوط اداریہ ہے، اس میں علی گڈھ میگزین کی عہد بعہد مختصر تاریخ، خصوصیات، زبان و ادب کی خدمات، اہم مضامین اور ممتاز مضمون نگاروں وغیرہ کا ذکر ہے، یہ نمبر محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا گیا ہے، اور علمی و ادبی دستاویز ہونے کی بنا پر اہم اور مفید ہے۔

آجکل کا اردو نمبر۔ مرتبہ جناب مہدی عباس حسینی صاحب، بڑی تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۹۶ قیمت ۔عہ پتہ پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی،

اردو کے مشہور و مقبول ادبی ماہنامہ "آجکل" نے اگست و ستمبر ۶۳ء میں "اردو نمبر" کے نام سے اپنا خاص شمارہ شائع کیا تھا، اس میں در اصل ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اردو کی موجودہ حالت اور رفتار کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ تیرہ مفید مضامین پر مشتمل ہے، ان میں بالترتیب اترپردیش، بہار، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، اندھراپردیش، میسور، مغربی بنگال، تملناڈو، راجستھان، گجرات، پنجاب، و ہریانہ، و ہماچل پردیش، جموں و کشمیر اور دہلی میں اردو کی صورت حال، ادبی و تعلیمی سرگرمیوں اور ترقی و اشاعت کی سرکاری و غیر سرکاری کوششوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ہر ریاست کے اردو بولنے والوں کی تعداد، مکاتب، مدارس، اسکولوں،

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم کے نظم و بندوبست، اردو اخبار و رسائل کی تعداد، اہم اور قابل ذکر اخبار و رسائل اور اشاعتی اداروں اور مطبعوں کے نام، مشہور شاعروں اور ادیبوں کی فہرست، ادبی انجمنوں، لائبریریوں اور اکیڈمیوں کی سرگرمیوں، سرکاری دفتروں میں اردو کے استعمال اور ریاستی حکومتوں کی طرف سے اردو ادیبوں اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی وغیرہ کے متعلق اعداد و شمار کی روشنی میں معلومات تحریر کئے گئے ہیں، ہر مضمون کے آخر میں اردو کی ترقی اور بقا کے لئے بعض مفید مشورے اور تجویزیں بھی پیش کی گئی ہیں، اکتوبر میں اسی نمبر کا ضمیمہ بھی شائع کیا گیا ہے، اس میں اردو مصنفین و قارئین، اخبار و رسائل کے مدیروں اور کتابوں کے ناشروں کے مسائل پر لوگوں کے خیالات اور اردو میں اصطلاحات سازی، ترجمے اور درسی کتابوں کے معاملات پر کچھ مفید باتیں ہیں، نومبر کے شمارہ میں ان ادیبوں اور شاعروں کی فہرست دی گئی ہے، جن کا ذکر سہواً اردو نمبر میں نہیں آسکا تھا، اور اردو مضامین میں، اڑیسہ اور آسام میں اردو کی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے، لیکن اس میں مذہبی مصنفین کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، اسی لئے متعدد معروف اہل قلم کا اس میں نام تک نہیں آسکا ہے، جو ایک بہت بڑی کمی ہے، اس سے قطع نظر اس نمبر سے ہندوستانی ریاستوں میں اردو کی موجودہ حالت اور سرگرمیوں کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے،

تحریر کا جوش ملسیانی نمبر:۔ مرتبہ جناب مالک رام صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۰۰، قیمت صر ۔ پتہ:۔ دفتر علمی مجلس ۲۹ ۴۸ چھتہ نواب صاحب فراشخانہ دہلی ۶

جناب جوش ملسیانی اردو کے کہنہ مشق ادیب و شاعر اور حضرت داغ دہلوی کے ممتاز تلامذہ میں ہیں۔ اب ان کے پایہ کے اصحاب کمال اور ماہرین فن کم ہی ہوں گے، ان کے بعض عزیزوں اور شاگردوں نے ان کی چھترویں سالگرہ کے موقع پر ان کی ادبی خدمات کے صلہ میں

ان کو ایک کتاب نذر کی تھی۔ اب ان کی ۹۰ ویں سالگرہ کے موقع پر اردو کے مشہور فاضل اور اہل قلم جناب مالک رام صاحب نے اپنے سہ ماہی مجلہ تحریر کا یہ خاص نمبر شائع کیا ہے۔ اس میں جناب جوش پر چار بلند پایہ مضامین شامل ہیں، جناب منور سہائے انور کا مضمون بڑا جامع اور محققانہ ہے۔ اس میں جوش صاحب کی شخصیت اور فن کا مبسوط جائزہ لیکر ان کی قادر الکلامی، مختلف اصناف سخن میں استادانہ مہارت، زبان کی اصلاحات اور تغزل کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، اس سے نہ صرف جوش صاحب کے عظمت و کمال بلکہ خود مضمون نگار کے، ذہن رسا اور فنی دسترس کا بھی اندازہ ہوتا ہے، لائق مرتب کا فاضلانہ مضمون بھی ان کے قلم کے معیار کے مطابق ہے، اس میں جوش کی عروض دانی شاعری میں دقت نظر اور غزل میں جودت طبع وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک مضمون جوش کے لائق فرزند عرش ملسیانی کے قلم سے ہے، انھوں نے اپنے والد محترم کے حالات اور شاعرانہ کمالات قلمبند کئے ہیں، جناب اسلوب احمد انصاری کے مضمون میں جوش صاحب کی شاعری اور تغزل پر بڑی خوبی کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے، نمبر کے آخر میں جوش کے کلام کا مختصر انتخاب ہے۔ جو غزلوں، نظموں اور رباعیات وغیرہ پر مشتمل ہے، جناب ساحر ہوشیارپوری کے نام جوش صاحب کے چند خطوط بھی درج کئے گئے ہیں، ان سے انکے فنی بصیرت، زبان و بیان پر قدرت اور طبیعت کے انکسار کا اندازہ ہوتا ہے، جوش ملسیانی صاحب کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کا مرقع شائع کر کے مالک رام صاحب نے ایک صاحب فن کو خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ اور ایک بڑی مفید ادبی خدمت بھی انجام دی ہے، اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تحریک کا بیس سالہ انتخاب نمبر:۔ مرتبین جناب گوپال متل، محمود سعیدی،

پریم گوپال متل صاحبان، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۴۴، قیمت معہ

پتہ ماہنامہ تحریک، ۹۔ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی،

مشہور ادبی ماہنامہ تحریک نے اپنی بیسویں سالگرہ کے موقع پر یہ خصوصی شمارہ شایع کیا ہے، اس میں تحریک کے اجراء (۱۹۵۳ء) سے ابتک (۱۹۷۳ء) کے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع کیا گیا ہے، اس کے مندرجات حسب ذیل آٹھ عنوانات میں منقسم ہیں۔ (۱) ہمارا موقف، (۲) مضامین (۳) تبصرے (۴) منظومات (۵) افسانے (۶) اسلام اور کمیونزم (۷) ویٹ نام جھوٹ اور سچ، (۸) قصہ ایک مدعی دانش کا پہلے عنوان کے تحت تحریک کے بیس سالہ ادارتی شذرات کا انتخاب درج ہے، اس میں بعض ادبی تصورات اردو کے مسائل اور قومی و سیاسی مباحث پر اظہار خیال کیا گیا ہے، یہ شذرے تحریک کے لائق مدیر کے قلم سے ہیں، جو اپنی بے لاگ تنقیدوں کی وجہ سے ممتاز مقام حاصل کر چکے ہیں، دوسرا حصہ میں اثر لکھنوی مرحوم، رشید حسن خان، قاضی عبد الودود، مالک رام اور امتیاز علی عرشی کے ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین ہیں، جو قابل مطالعہ ہیں، تیسرے حصہ میں نئی مطبوعات پر تحریک میں شائع شدہ پر مغز تبصروں کا انتخاب ہے، چوتھا اور پانچواں حصہ موجودہ دور کی مشہور نظموں، غزلوں اور افسانوں کے انتخاب پر مشتمل ہے، جناب گوپال متل کا قلم کمیونزم پر تنقید کرنے میں بڑا بیباک ہے اور وہ اس کے رد میں متعدد مضامین اور کئی کتابیں لکھ چکے ہیں اس لئے چھٹے اور ساتویں حصے میں اشتراکیت کے دعووں اور پروپگنڈوں کا تار و پود بکھیر کر اس کے اصلی خط و خال اور اسلام دشمنی کو دکھایا گیا ہے آخر میں جناب فراق گورکھپوری سے متل صاحب اور بعض دوسرے ادیبوں کے رد و کد کا ذکر ہے، اس ضخیم نمبر سے گذشتہ بیس سال کی ادبی رفتار و ارتقار کا بھی ایک حد تک اندازہ ہوجاتا ہے، اس اعتبار سے اس کی اشاعت ایک مفید ادبی خدمت ہے۔

نیا دور کا احتشام نمبر:۔ مرتبہ۔ جناب خورشید احمد صاحب تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۸ قیمت عہ پتہ۔ محکمہ اطلاعات، اترپردیش، لکھنؤ۔

محکمہ اطلاعات اترپردیش کے ادبی ماہنامہ "نیا دور" نے اردو کے ۔۔۔ مشہور ادیب اور جدید طرز کے نقاد پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی یادگار میں اپنا خاص نمبر شائع کیا ہے، اس میں ان کے خدمات و کمالات کا اعتراف کر کے ان کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، یہ نمبر متنوع معیاری مضامین نظم و نثر پر مشتمل ہے، اور احتشام صاحب کی سیرت و شخصیت اور ادبی و تنقیدی کارناموں کا مرقع ہے، اس میں مضامین مختلف عنوانات کے تحت خوش سلیقگی سے درج کئے گئے ہیں، شروع میں اترپردیش کے موجودہ گورنر عالی جناب اکبر علی خاں صاحب اور بعض مرکزی و صوبائی وزرا کے پیغامات اور متعدد مشاہیر علم و فن کے تاثرات ہیں، پہلے حصہ میں احتشام صاحب کی بلند شخصیت اور ان کے دل نواز اوصاف کا ذکر ہے، دوسرے حصہ میں ان کے ادبی و تنقیدی کارنامے اور کمالات پر تبصرے ہیں، تیسرے حصہ میں ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کے اور پہلوؤں پر مفید مضامین ہیں، نظم کے حصوں میں جمیل مظہری، فرقت کاکوروی، انضا ابن فیضی، واحد پریمی، اور دوسرے شعرا نے ان کو اپنے نذرانۂ عقیدت پیش کئے ہیں، نثری حصے میں آل احمد سرور اور علی جواد زیدی کے مضامین خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہیں کیونکہ یہ دونوں حضرات ان سے بہت ہی قریب تر رہے۔ ابتدا میں مرحوم کے چھوٹے بھائی انصار حسین نے ایک مقالہ میں اور ان کے عزیز شمیم کرہانی نے اپنی نظم میں دل کھول کر ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جس سے مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، آخر میں احتشام مرحوم کی چند نظمیں، غزلیں،

بعض غیر مطبوعہ تحریریں اور خطوط دے گئے ہیں، ان کی تحریروں کے عکس اور ان کی متعدد دوسری تصویروں سے بھی یہ نمبر دلچسپ بنایا گیا ہے، مضامین کی رنگا رنگی اور ترتیب کی خوش سلیقگی اور مواد و معلومات کے لحاظ سے یہ نمبر عمدہ احتشام مرحوم کے قدر دانوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

نقش کوکن کا احتشام نمبر: مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی ایم اے وغیرہ تقطیع متوسط کاغذ معمولی کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۳۰، قیمت ۵ روپیے پتہ۔ منیجر ماہنامہ نقش کوکن ۴۴ حبیل رڈ دالیسٹ ڈونگری، بمبئی نمبر ۹

یہ بمبئی کے ماہنامہ نقش کوکن کا احتشام نمبر ہے، اس میں بھی احتشام صاحب کو منظوم و منثور خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، اس سے ان کی شخصیت اور حالات و کمالات پر مفید معلومات حاصل ہونگے، پروفیسر عبدالمغنی اور ڈاکٹر محمود الٰہی کے مضامین گو ماخوذ ہیں، تاہم ادبی حیثیت سے پر مغز ہیں۔ ان میں احتشام کے فن کے دونوں رخوں کا ذکر یعنی خوبیوں کے ساتھ بعض خامیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، ڈاکٹر محمد حسن اور راسد حیدر کے مضامین بھی سیر حاصل اور قابل ذکر ہیں، ایک مضمون میں ان کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے، علی جواد زیدی کی ماتمی نظم موثر اور درد انگیز ہے، شروع میں احتشام صاحب کے خود نوشت حالات اور آخر میں ان کے کئی تنقیدی مضامین کے اقتباسات اور بعض نظمیں نقل کی گئی ہیں، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر بھی اچھا اور احتشام صاحب کے قدر دانوں کی دلچسپی کے لائق ہے۔

ندائے ملت: مرتبہ۔ جناب عبدالقدوس و نور عظیم ندوی و نذر الحفیظ ندوی صاحبان، لمبا اخباری سائز کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۶۶ قیمت ۵ روپیے، پتہ۔ دفتر ندائے ملت ۵۵۔ گوئن روڈ لکھنؤ

ہفت روزہ ندائے ملت قومی و ملی مسائل کی بیباک ترجمانی اور ملک کی داخلی و خارجی سیاست پر بے لاگ تبصروں اور جرأتمندانہ مضامین کے لئے شہرت رکھتا ہے، اس نے معمول کے مطابق اگست ۷۳ء میں اپنا خاص نمبر شائع کیا تھا، اس میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد کے ہندوستان کے حالات و مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے، گذشتہ ڈھائی تین سال کے درمیان رونما ہونے والے سیاسی مسائل، ابتر معاشی و سماجی حالات، اقلیتوں اور پسماندہ قوموں کے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ اور ہند و روس معاہدہ کے اثرات وغیرہ کے متعلق مواد و معلومات مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں، شروع میں ۷۱ء کے پارلیمانی انتخابات کے کانگریسی منشور اور بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد وزیر اعظم کی تقریروں کے بعض اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں، اس کے بعض مضامین میں گذشتہ تین سال کے درمیان میں ملک کو درپیش مشکلات، بنگلہ دیش کے قیام سے وابستہ توقعات کی ناکامیوں، معاشی و غذائی بحران، اشیاء ضروری کی قلت، افراط زر اور ہند و روس معاہدہ کے نتائج پر اظہار خیال کیا گیا ہے، مولانا محمد عثمان فارقلیط، مسز نین تارا سہگل اور دھرم پرکاش شرما کے مضامین پڑھنے کے لائق ہیں، "صبح نو کی کرن" میں ملک کے گذشتہ حالات و واقعات سے سبق لیکر مسلمانوں کو اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے اور بہتر مستقبل کی تشکیل کی تلقین کی گئی ہے، منظومات کا حصہ بھی اچھا ہے، پروفیسر جے۔ جی تیواری نے سوویٹ خارجہ پالیسی کے مطمح نظر کو جس طرح واضح کیا ہے، اس سے مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، بعض مضامین کا لہجہ ضرورت سے زیادہ تلخ ہے، اور اس نمبر میں حکومت کی دشواریوں اور مشکلات پر قابو پانے کی مخلصانہ کوششوں اور اس کی واقعی مجبوریوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، ممکن ہے اس کا سبب موجودہ تشویش انگیز حالات و مسائل اور ان کے

دور رس اثرات کی جانب ملک کے جمہوریت پسند طبقہ اور خود حکومت کے ذمہ داروں کو متوجہ کرنا ہو۔ اس حیثیت سے یہ نمبر قابل قدر ہے،

نیا دور کا آزادی نمبر:۔ مرتبہ۔ جناب خورشید احمد صاحب، لمبی تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۸۰ قیمت ۵۰ پیسے، پتہ:۔ محکمہ اطلاعات اتر پردیش لکھنؤ،

اس نمبر میں عام شماروں کی طرح ادبی مقالوں، افسانوں اور غزلوں کے علاوہ آزادی کے متعلق بھی کچھ مضامین اور نظمیں شامل ہیں، ممتاز صحافی جے۔ این ساہنی کے مضمون میں ۳۰ء کے جواہر لال نہرو کی صدارت میں کانگریس کے اجلاس لاہور کی تکمیل آزادی کے رزولیشن پر اچھا تبصرہ ہے، ایک مضمون میں آزادی کے بعد کی ترقیوں اور منصوبوں کے ساتھ ان دشواریوں کا ذکر ہے، جن سے اس وقت ملک دوچار ہے اور آخر میں آزادی کی بقا اور ملک کی خاطر خواہ ترقی کے لیے قوم کو غیر معمولی جد وجہد اور مشکلات کا عزم وحوصلہ سے مقابلہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے، الطاف حسین کے مضمون "مواد وہیئت" اور جناب ظفر ادیب کے مقالہ "اردو شاعری میں جدیدیت کی تحریک" سے انکی محنت وکاوش کا اظہار ہوتا ہے، افسانوں اور نظموں کا حصہ بھی قابل قدر ہے، یہ نمبر مختلف تصویروں کے ساتھ خوش سلیقگی سے مرتب کیا گیا ہے،

تعمیر فکر کا تعلیمی نمبر:۔ مرتبہ مولوی محمد شہاب الدین ندوی صاحب متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۹۶، قیمت۔ عہ پتہ۔ ماہنامہ تعمیر فکر ۱۴۲ پولیس روڈ بنگلور ۲

اس ماہنامہ اور اس کے ایک خاص نمبر کا ذکر معارف میں پہلے کیا جا چکا ہے، اب اس نے گذشتہ سال کے آخر میں پٹنہ میں ہونے والی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سائٹی کی چوتھی کانفرنس کے موقع پر یہ خاص نمبر شائع کیا تھا۔ اس کا مقصد مغربی تعلیم کے ہولناک نتائج اور

موجودہ نظام تعلیم کی دینی و دنیاوی تقسیم کو غلط ثابت کر کے اسلامی اور عصری دونوں علوم کی تحصیل کی ضرورت کا احساس دلانا ہے، اسی نقطہ نظر سے اس میں علامہ سید سلیمان ندوی ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا ابو الحسن علی ندوی، اور مولانا محمد عمران خان ندوی کی بعض پرانی تحریریں شائع کی گئی ہیں، شروع میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے نائب صدر ڈاکٹر ممتاز احمد خان کا ایک انٹرویو بھی ہے، اس نمبر کے اکثر مضامین مختصر اور ہلکے پھلکے ہونے کے باوجود مفید ہیں،

چند نئے اخبار

احتساب:۔ از مولانا محمد تقی امینی متوسط اخباری سائز، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحے ۸ قیمت سالانہ ۶ فی پرچہ ۱۰ پیسے، پتہ۔ ادارۂ احتساب امینی منزل دودھ پور، علی گڑھ،

یہ پندرہ روزہ اخبار مسلمانوں کی ذہنی وفکری اصلاح اور رہنمائی کے علاوہ موجودہ دور کے مسائل کا اسلامی نقطہ نظر سے حل فراہم کرنے کے لیے جاری کیا گیا ہے، اس میں فقہی سوالات کے جوابات بھی شائع کئے جاتے ہیں، اس کے لائق مدیر مولانا تقی امینی اپنے مذہبی اور فقہی مضامین کی وجہ سے ملک میں امتیازی حیثیت حاصل کرتے جا رہے ہیں، اس میں ان ہی کے زیادہ تر مضامین ہوتے ہیں جو اس کے مفید ہونے کی پوری ضمانت ہیں۔

کانفرنس گزٹ:۔ مرتبہ مولوی عبید الرحمن خان صاحب شروانی، اخباری سائز، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۸ قیمت سالانہ ۵ فی پرچہ ۳۰ پیسے، پتہ دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اخبار گذشتہ سال سے دوبارہ حاجی عبید الرحمن خاں شروانی کی سرپرستی اور ادارت میں شائع ہو رہا ہے، کانفرنس کی خبروں اور مفید مضامین پر مشتمل ہوتا ہے، اس میں ڈاکٹر کبیر احمد جائسی کے اداریے باوزن اور سنجیدہ ہوتے ہیں، خدا اس کو دوام نصیب کرے۔

مطبوعات جدیدہ

کتاب الایمان ۔ مرتبہ مولانا احمد خاں صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۴۰، قیمت دو روپے ۵۰ پیسے، پتہ: مکتبہ اسعیدیہ نمبر ۲۲ زکریا اسٹریٹ کلکتہ ۱۲

اس میں ایمان مفصل کی تشریح اور بنیادی اسلامی عقائد توحید، نبوت، آسمانی کتب، ملائکہ، آخرت اور تقدیر پر گفتگو کی گئی ہے، شروع میں دین و مذہب کی ضرورت و اہمیت بھی بیان کی گئی ہے۔ اسلامی عقائد پر اردو میں بہت لکھا گیا ہے، اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عام فہم اور سہل انداز میں اختصار کے ساتھ عقائد کے متعلق ضروری معلومات تحریر کیے گئے ہیں، اس لیے معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

پربت اور پنگھٹ ۔ مرتبہ جناب محمد یوسف ٹینگ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت، وطباعت اچھی، صفحات ۲۴۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت تحریر نہیں، پتہ: جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، کشمیر۔

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز نے کشمیر کی دو علاقائی زبانوں ڈوگری اور کشمیری کے افسانوں کا اردو ترجمہ شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، یہ اس سلسلہ کا پہلا مجموعہ ہے، اس میں آٹھ ڈوگری اور سات کشمیری کہانیوں کے اردو ترجمے شامل ہیں، ہر حصے کے شروع میں افسانہ نگاروں کا مختصر سوانحی خاکہ بھی دیا گیا ہے، ترجمہ اچھا اور افسانے ہیئت و تکنیک کے اعتبار سے بہتر ہیں، اکیڈمی ڈوگری اور کشمیری کہانیوں کے اس انتخاب و ترجمہ کی اشاعت پر اردو خواں طبقے کے شکریہ کی مستحق ہے، یہ مجموعہ افسانے اور کہانیاں کے شائقین کی دلچسپی کے لائق ہے۔

"ض"

جلد ۱۱۴ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۴ء عدد ۳

مضامین